

حاتم طائی لاہور میں

اے. حمید

پہلا حصّہ

حاتم طائی لاہور میں

بچّوں کے لیے ناول

دل چسپ، حیرت انگیز اور پُراسرار

اے۔ حمید



فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

غیرمجلد: 1 00637 0 969

ترمیم شدہ ــــــــــــ ۲۰۱۱ء

فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ

ہیڈ آفس و شوروم: 60۔ شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

راولپنڈی آفس: 277۔ پشاور روڈ، راولپنڈی۔

کراچی آفس: فرسٹ فلور، مہران ہائٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی۔

حاتم طائی لاہور میں	Hatam Tai Lahore Mein
اے۔ حمید	A. Hameed

مطبوعہ فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام ظہیر سلام پرنٹر و پبلشر

email:support@ferozsons.com.pk

www.ferozsons.com.pk

حاتم کون تھا؟

حاتم عرب کے ایک قبیلے طے کا سردار تھا، اور آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے پیدا ہُوا تھا۔ وہ اِتنا سخی اور دِل والا تھا کہ اُس کے دَر سے کوئی سوالی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ رحم دِل اِتنا تھا کہ کسی کو مُصیبت میں پھنسا دیکھ لیتا تو اُس وقت تک چین نہ لیتا جب تک اُس کی مُصیبت دُور نہ کر دیتا۔ سارا عرب اُس کے نام کا کلمہ پڑھتا تھا، اور عرب سے باہر بھی اُس کی سخاوت، دریا دِلی اور اِنسان دوستی کی دُھوم مچی ہوئی تھی۔

جب وہ بُوڑھا ہو گیا اور اُس کے چل چلاؤ کا وقت آن پُہنچا تو ایک بُزرگ اُس کے پاس آئے اور کہنے لگے "اے حاتِم، تُو نے اپنے نیک کاموں سے اِنسان کا سر اُونچا کر دیا ہے۔ خُدا تُجھ سے بُہت خُوش ہے، اور موت بھی تیری رُوح قبض کرتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔ تُو اُس غار میں جا کر سو جا جو یہاں سے کُچھ دُور، ایک

پہاڑی کے دامن میں، ہے۔ تو ڈیڑھ ہزار سال تک وہاں سوتا رہے گا۔ اس کے بعد اِس طویل نیند سے جاگے گا اور دوبارہ اِس دُنیا میں آ کر ضرورت مندوں کی ضرورت اور حاجت مندوں کی حاجت پُوری کرے گا۔"

یہ ایک کہانی ہے، اور اِسے کہانی ہی سمجھنا چاہیے۔

بہرحال، کہتے ہیں حاتم ڈیڑھ ہزار سال تک اُس غار میں سویا رہا۔ اس کے بعد جاگا تو پھر دُکھیوں کے دُکھ دُور کرنے کے لیے نکل کھڑا ہُوا۔

سب سے پہلے وہ لاہور آیا، کیوں کہ اُسے معلوم ہُوا تھا کہ لاہور میں دُکھیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ لاہور آ کر اُس نے کیا کیا؟ ——— یہ اِس ناول میں پڑھیے۔

پہلی مُصیبت

حاتم طائی لاہور کے ہوائی اڈّے پر اُترتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

مسافروں نے اُسے گھیر لیا۔ وہ عربی لباس میں تھا، کمر کے گرد پٹکا بندھا تھا اور پٹکے کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔ فوراً ہی ائیر پورٹ کے ڈاکٹر نے اُس کے ٹیکا لگایا اور اُسے ہوش آ گیا۔ ہوش میں آتے ہی اُس نے پُوچھا:

"میں کہاں ہُوں؟"

ایک ائیر ہوسٹس نے مُسکرا کر کہا "تُم لاہور کے ہوائی اڈّے پر ہو۔"

یہ سُن کر حاتم طائی نے ایک چیخ ماری اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ اُسے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ساری رات وہ بے ہوش رہا۔ صبح اُس نے دیکھا کہ وہ میو ہسپتال کے ایک وارڈ میں پڑا ہے

اور گلوکوز کے ڈرپ کی سُوئی اُس کے بازو
میں لگی ہُوئی ہے۔ ایک موٹی سی نرس چارٹ
اُٹھائے اس کے پاس آئی۔

"مسٹر، تمھارا نام کیا ہے؟"

حاتم طائی نے کہا "میرا نام حاتم طائی ہے،
اور میں عرب سے آیا ہُوں۔"

موٹی نرس نے غُصّے سے کہا "مسٹر! ہم سے
مذاق مت کرو۔ حاتم طائی کو مرے ہُوئے ہزار
سال سے اُوپر ہو گئے۔ جلدی بتاؤ، تمھارا نام
کیا ہے؟"

حاتم بولا "میں سچ کہہ رہا ہُوں۔ میں وہی
حاتم طائی ہُوں، جس کی سخاوت کے قصّے ساری
دُنیا میں مشہُور ہیں۔"

موٹی نرس نے حاتم طائی کے مُنھ میں
تھرمامیٹر ٹھُونس کر کہا "تمھیں تو پاگل خانے پہنچانا
چاہیے تھا۔ اب مُنھ بند رکھو، اپنا۔"

نرس ٹمپریچر لے کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ حاتم
سوچنے لگا کہ یہ شیشے کی نلکی کیسی تھی جو یہ
عورت اس کے مُنھ میں ڈال کر لے گئی ہے۔

اِتنے میں لاہور کے ایک اخبار "افلاطون" کا نامہ نگار حاتم طائی سے انٹرویو لینے آ گیا۔ اُس نے حاتم طائی سے اپنا تعارف کرایا اور کہا:

"اے مردِ سخی، میں اخبار افلاطون کی جانب سے تمھیں لاہور آنے پر مُبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میری کاپی پریس میں جانے والی ہے۔ ذرا جلدی سے بتا دو کہ تم لاہور میں کیسے آن ٹپکے، کیوں کہ تم تو آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عرب میں ہوا کرتے تھے؟"

حاتِم طائی نے ایک آہ بھر کر اِنٹرویو لینے والے کی ڈاڑھی میں ہاتھ پھیرا اور کہا "اے افلاطون کے بیٹے، میں عرب کے صحرا میں گشت کر رہا تھا کہ ایک مردِ بُزرگ سے مُلاقات ہو گئی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اے حاتِم طائی، عرب کے لوگوں کے تو سارے مسئلے حل ہو گئے ہیں۔ اب تُو لاہور جا، جو یہاں سے دُور، دریائے راوی کے کنارے، آباد ہے، اور مُلکِ پاکستان کا دُوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ وہاں جا کر لوگوں کے سوال پُورے کر، کیوں کہ لاہور کے لوگوں کے پاس بہت سے سوال ہیں، جِسے

آج تک کوئی پُورا نہیں کر سکا۔
"پس اُس مردِ بُزرگ نے مجھے آنکھیں بند کرنے کو کہا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جب دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میں ایک اُڑن کھٹولے پر بیٹھا تھا۔"
"یعنی بوئنگ 707 میں" نامہ نگار نے کہا۔
"میں اُسے اُڑن کھٹولا ہی کہوں گا۔ اُس اُڑن کھٹولے میں بہت سے لوگ تھے اور خُوب صُورت لڑکیاں خُوش نُما لباس پہنے، مُسکرا مُسکرا کر، مسافروں کو مٹھائیاں دے رہی تھیں۔ مجھے چکّر آ رہے تھے، مگر ضبط کیے بیٹھا رہا۔ لیکن یہاں پُہنچ کر اُڑن کھٹولے کی سیڑھیاں اُترنے لگا تو چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔"
اخبار نویس نے پُوچھا "تمھارا لاہور شہر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
حاتِم طائیؒ نے کہا "ابھی میں نے لاہور شہر کی سیر نہیں کی۔"
اخبار نویس نے پُوچھا "لاہور میں کب تک ٹھہرنے کا اِرادہ ہے؟"

حاتم طائی نے کہا "سنا ہے یہاں لوگوں کے پاس بہت سے سوال ہیں، جن کا کوئی حل نہیں ہے۔ جب تک میں اُن کے سوال پورے نہیں کر لیتا، یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

اخبار نویس نے کہا "مسٹر حاتم طائی، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم یہاں سے پاگل ہو کر جاؤ گے۔"

"وہ کس طرح؟" حاتم طائی نے پوچھا۔

اخبار نویس بولا "وہ اس طرح کہ اس شہر کے ہر آدمی کے پاس کتنے ہی سوال ہیں۔ تم کس کس کے سوال پورے کرو گے؟ تم تو پاگل ہو جاؤ گے۔"

حاتم طائی نے مسکرا کر کہا "اے افلاطون کے بیٹے، میرا تو کام ہی لوگوں کے مسئلے حل کرنا ہے۔ لوگوں کے سوال ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ پھر میں کیسے پاگل ہو سکتا ہوں۔"

اخبار نویس کہنے لگا "اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو تم سے اگلی ملاقات پاگل خانے میں ہوگی۔"

یہ کہہ کر اخبار نویس کاپی پنسل جیب میں ڈال کر وہاں سے بھاگ گیا۔

دو دن بعد حاتم طائی تندرست ہو کر ہسپتال سے چلا آیا اور لاہور شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ ایک جگہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک لڑکا ایک باغ میں گھاس پر بیٹھا کتاب سامنے رکھے سبق پڑھ رہا ہے۔ حاتم طائی اس کے پاس جا کر بولا:

"بیٹے، تم کیا پڑھ رہے ہو؟"

لڑکے نے دیکھا کہ ایک عربی لباس والا آدمی، کمر میں تلوار لٹکائے، اُس کے پاس کھڑا ہے۔ اُس نے پُوچھا "انکل، آپ کون ہیں؟"

حاتم طائی نے کہا "بیٹے، میں حاتم طائی ہُوں۔"

لڑکے نے خُوش ہو کر کہا "اچھا، تو آپ وہ حاتم طائی ہیں جو لوگوں کے سوال پُورے کرتا تھا؟"

"ہاں بیٹا، میں وہی حاتم طائی ہُوں اور تمھارے شہر میں لوگوں کے سوال پُورے کرنے آیا ہُوں۔ تم کوئی سوال کرو۔ میں پُورا کروں گا۔"

لڑکے نے کہا "انکل حاتم، میں دسویں جماعت کا طالبِ علم ہُوں۔ کیا آپ میرا ایک سوال حل کر دیں گے؟"

"ضرور۔ تم سوال کرو۔"
لڑکے نے کہا "یہ سوال فزکس کا ہے۔"
حاتم طائی نے حیرانی سے پوچھا "یہ کیا بلا ہوتی ہے؟"
لڑکا بولا "یہ ایک علم ہے۔"
حاتم سر کھجانے لگا، بولا "اچھا تم سوال کرو۔ ایسا کون سا سوال ہے جس کو میں حل نہ کر سکوں۔"
لڑکے نے سوال کیا:
"یہ بتائیے کہ کسی بھی گیس کے ایک گرام مول کے لیے گیس کی مستقل قیمت 8.31J/MOLE×°K ہوتی ہے اور اسے ہم R سے ظاہر کرتے ہیں۔ اگر مولر گیس کے مستقل کو سالمات کی تعداد سے تقسیم کیا جائے تو وہ کس کا مستقل کہلائے گا؟"
لڑکے نے سوال ختم کیا تو اس نے دیکھا کہ حاتم طائی سر پکڑے گھاس پر بیٹھا ہے اور زار و قطار رو رہا ہے۔
لڑکے نے پریشان ہو کر پوچھا "انکل آپ رو کیوں رہے ہیں؟"
حاتم طائی نے کہا "برخوردار! تم نے ایسا سوال کیا ہے کہ اسے عرب کے سارے جن مل کر بھی حل نہیں کر سکتے۔ تمھارے سوال نے میرے ہاتھوں

کے طوطے اُڑا دیے ہیں۔ اب میں اپنے طوطوں کی تلاش میں جا رہا ہُوں۔ خُدا حافظ !"

حاتم طائی لڑکھڑاتا، چکراتا ہُوا اُٹھا اور اپنے ہاتھوں کے اُڑے ہُوئے طوطوں کی تلاش میں ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے وہ انارکلی بازار میں پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک درخت کے نیچے کوئی آدمی پنجرا لیے بیٹھا ہے جس میں کتنے ہی طوطے قید ہیں۔ حاتم اُس کے پاس جا کر بولا:

"اے بھائی، تُو نے میرے طوطے تو نہیں دیکھے؟"

طوطے والے نے تعجب سے حاتم طائی کے عربی لباس اور تلوار کو دیکھا اور پُوچھا "تُم تو مُجھے بغدادی چور لگتے ہو۔"

حاتم طائی نے کہا "میرے بھائی، بغدادی چور میرے ماموں کے لڑکے کا پڑپوتا تھا اور سُنا ہے کہ آج کل وہ بھی لاہور آیا ہُوا ہے۔"

طوطے والا بولا "لاہور میں تو کتنے ہی بغدادی چور رہتے ہیں۔ کِس کِس کو دیکھو گے؟ اچھّا، یہ بتاؤ، تُم کون ہو، میرے عربی ٹارزن؟"

"بھائی، میں نے کہا نا کہ میں حاتم طائی ہُوں۔"

طوطے والا قہقہہ مار کر ہنس پڑا "حاتم طائیؔ ہو تو
غرب جاؤ۔ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

حاتم طائیؔ نے کہا :

"بھائیؔ، تم سے پہلے دسویں جماعت کے ایک
طالب علم نے مجھ سے ایک جناتی سوال کیا تھا، جس
کو سن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔
اب وہی طوطے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ کیا تمھارے
پنجرے میں میرے ہاتھوں کے طوطے تو نہیں ہیں؟"

طوطے والے نے سر ہلا کر کہا "میرے پنجرے
کے طوطوں کے تو خود طوطے اُڑے ہوئے ہیں۔
وہ بے چارے کسی کے ہاتھوں سے کیا اُڑ کر
آئیں گے۔ جاؤ بھائیؔ عربی ٹارزن صاحب، اپنا
راستہ ناپو۔"

حاتم طائیؔ نے جیب سے فٹ نکالا اور راستہ
ناپنے لگا۔ جب اُس نے پچاس فٹ راستہ ناپ لیا
تو اچانک ایک موٹر کار سامنے آ گئی۔ کار نے
بڑے زور سے ہارن بجایا۔ حاتم طائیؔ اصیل مرغ کی
طرح اُچھل کر فٹ پاتھ پر آ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ
سامنے لڑکیوں کا ایک سکول ہے اور ایک بھولی سی،

پیاری سی، بچّی کاپی سامنے رکھے، بنچ پر بیٹھی، گردن ہلا ہلا کر سبق یاد کر رہی ہے۔ حاتم نے قریب جا کر بچّی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

"بیٹی تم کیا پڑھ رہی ہو؟"

بچّی نے کہا "انکل، میں اُردو گریمر یاد کر رہی ہُوں۔"

حاتم طائی نے سر کھجا کر پُوچھا "گریمر کیا ہوتا ہے، بیٹی؟"

بچّی نے کہا "ہوتا نہیں، ہوتی ہے۔ اچھّا، میں آپ سے ایک سوال کرتی ہُوں۔ کیا آپ اس کا جواب بتائیں گے؟"

حاتم طائی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "بیٹی! میری آدھی زندگی لوگوں کے سوال حل کرتے گُزری ہے، مگر خُدا کے لیے کوئی جنّوں والا سوال نہ کر دینا۔"

بچّی نے ہنس کر کہا "بڑا آسان سوال ہے، انکل۔ اچھّا، یہ بتائیں کہ مشبّہ حسّی اور مُشبّہ بہٖ عقلی اور مُشبّہ عقلی اور مُشبّہ بہٖ حسّی میں کیا فرق ہے، اور طرفین تشبیہ ہر دو عقلی کسے کہتے ہیں؟"

حاتم طائی نے ایک دردناک چیخ ماری اور وہاں

سے سر پیٹتا ہُوا شارع قائدِ اعظم کی طرف بھاگ نِکلا۔
آگے جا کر اُس نے دیکھا کہ ایک جگہ لوہے کا دروازہ بنا ہے اور لوگ اس کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ بچّے زیادہ تھے۔ معلوم ہُوا کہ یہ چڑیا گھر ہے۔ وہاں اس قدر رش تھا کہ تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حاتِم نے جیب سے ایک تِل نِکال کر اُسے زمین پر دھرنے کی کوشش کی مگر کام یاب نہ ہو سکا۔
سامنے ایک کھڑکی تھی، جس میں ہاتھ ڈال کر لوگ ٹکٹ لیتے اور اُسے دِکھا کر چڑیا گھر کے دروازے میں داخل ہو جاتے۔ حاتِم طائیؒ بھی لائن میں کھڑا ہو گیا۔ جب اُس کی باری آئی تو اُس نے جیب سے سونے کی اشرفی نِکال کر ٹِکٹ والے کو دی اور کہا:
"بھائی، ایک ٹکٹ دے دو۔"
سونے کی اشرفی دیکھ کر ٹکٹ بابُو چونک اُٹھا اور حاتِم کی طرف دیکھ کر بولا "تُم دوبئی سے آئے ہو کیا؟"
حاتِم نے کہا "میرا نام حاتِم طائیؒ ہے۔ میں عرب سے آیا ہُوں۔"

اس پر ٹکٹ بابُو بولا "مسٹر حاتم طائی، یہ سونے کی اشرفی تو تم سونا بازار جا کر فروخت کرو۔ آج کل سونے کا بھاؤ چڑھا ہُوا ہے۔ مجھے تو کاغذ کا نوٹ دو، ایک رُوپے والا۔"

حاتم کے پیچھے جو آدمی قطار میں کھڑا تھا اُس نے کہا "تمھارے پاس اتنا سونا ہے۔ جاؤ، گھر جا کر چین کی بانسری بجاؤ۔"

حاتم طائی قطار میں سے نکلا اور چین کی بانسری کی تلاش میں نکل کھڑا ہُوا۔ وہ بانسوں والے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ ایک آدمی کو دیکھا کہ بانسریاں بیچ رہا ہے۔ اُس نے کہا:

"بھائی، کیا یہاں کے لوگ چیزیں بجا بجا کر بیچتے ہیں؟"

وہ آدمی بانسری ہونٹوں سے الگ کرتے ہُوئے بولا "میں تمھاری بات سمجھا نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

حاتم طائی نے کہا "میرا مطلب ہے، تم بانسریاں فروخت کرتے ہو اور بانسری بجاتے بھی ہو۔"

بانسری والا ہنس پڑا۔ بولا:

"تم تو مجھے مسخرے لگتے ہو، شکل سے بھی اور

باتوں سے بھی۔ اب بولو، تُمھیں کیا چاہیے؟"

حاتم طائیؒ نے کہا "بھائی، تُمھارے پاس جو یہ بانسریاں ہیں، کیا اِن میں کوئی چَین کی بانسری بھی ہے؟"

بانسری والا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حاتم طائیؒ کو تکنے لگا "وہ کس لیے چاہیے تُمھیں؟"

حاتم نے کہا "ایک شخص نے کہا تھا کہ گھر جا کر چَین کی بانسری بجاؤ۔ چُناں چہ اب میں چَین کی بانسری کی تلاش میں ہُوں۔"

بانسری والا سمجھ گیا کہ یہ شخص کوئی بھولا بھالا آدمی ہے۔ جھٹ سے ایک بانسری اُسے تھماتے ہُوئے بولا "یہ لو میاں۔ یہ رہی تُمھاری چین کی بانسری۔ اِسے گھر لے جا کر مزے سے بجاؤ۔"

"اِس کے دام کتنے ہیں؟" حاتم نے پُوچھا۔

بانسری والے نے کہا "تُمھارے پاس جو ہے، دے دو۔"

حاتم طائیؒ نے جیب سے سونے کی اشرفی نِکال کر دی اور کہا "میرے پاس تو اِس وقت یہی ایک اشرفی ہے۔"

بانسری والے نے اشرفی جھپٹ کر جیب میں ڈالی اور یہ کہہ کر بانسوں والے بازار سے رفوچکّر ہو گیا کہ چلو، کوئی بات نہیں۔ یہی کافی ہے۔

حاتم کو بھوک لگ رہی تھی۔ دہلی دروازے کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اُس نے کھانا کھایا اور زیادہ مرچوں کی وجہ سے سی سی کرتا ہُوا باہر نکل آیا۔ یہاں اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ راہ گیروں سے کہہ رہا ہے:

"نیکی کر، دریا میں ڈال۔ ہے کوئی خُدا کا بندہ جو مجھے نیکی کر دریا میں ڈال کا مطلب بتا دے؟"

حاتم طائی اُس کے قریب سے گزرا تو اُس نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور اُس سے بھی یہی سوال کیا۔

حاتم طائی نے کہا "فکر نہ کرو۔ میں تمھارے سوال کے جواب کی تلاش میں جاتا ہُوں، اور اِن شاء اللہ اس کا جواب لے کر ہی واپس آؤں گا۔ میرا اِنتظار کرنا۔"

حاتم طائی نیکی کر دریا میں ڈال کا مطلب تلاش

کرنے دریائے راوی کی طرف روانہ ہُوا۔ اُس کا خیال تھا کہ دریا پر اُسے اِس سوال کا جواب ضرور مِل جائے گا۔ جب وہ ٹکسالی دروازے کے پاس پُہنچا تو ایک جگہ ایک بُوڑھے آدمی کو دیکھا کہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہے اور پُکار پُکار کر کہہ رہا ہے :

"کوئی ہے خُدا کا بندہ جو مجُھے میرے گھر پُہنچا دے۔"

حاتم طائی کی رگِ ہمدردی پھڑک اُٹھی۔ جھٹ اُس کے پاس جا کر بولا "بابا جی، میں تمُھاری خدمت کو حاضر ہُوں۔"

بُوڑھے نے کہا "بیٹا، مجُھے کندھوں پر بِٹھا کر گھر پُہنچا دو۔"

حاتم نے بابا کو کندھوں پر بِٹھایا اور اُس کے گھر کی طرف روانہ ہُوا۔ بابا کا گھر آ گیا اور حاتم نے اُسے نیچے اُتارنا چاہا تو بابا نے کہا :

"بیٹا! مجھے تمُھارے کندھوں پر گھر سے زیادہ آرام مِلا ہے۔ اب میں تمُھارے کندھوں ہی پر رہوں گا۔"

حاتم طائی گھبرا گیا کہ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح بابا اُس کے کندھوں سے اُتر آئے، مگر اُس نے اُترنے سے انکار کر دیا، کہنے لگا "اب مجھے باغ کی سیر کراؤ۔"

حاتم بے چارہ بُوڑھے کو کندھے پر اُٹھائے باغ میں آ گیا۔ بُوڑھے نے پہلے سارے باغ کی سیر کی، پھر بولا:

"اب مجھے مُرمرے لے کر کھلاؤ۔"

حاتم نے اُسے مُرمرے خرید کر دیے اور وہ اس کے سر پر رکھ کر مزے سے کھانے لگا۔ حاتم کا کندھا درد کرنے لگا تھا، مگر وہ بابا کو نیچے بھی نہیں پھینک سکتا تھا، کیوں کہ اُس نے اپنی ٹانگیں حاتم کی گردن میں پھنسا رکھی تھیں۔

حاتم نے بڑے جتن کیے کہ کسی طرح بُوڑھے کو نیچے اُتار دے مگر وہ تو ایسا جم کر بیٹھا تھا کہ نیچے اُترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

آخر حاتم کو ایک ترکیب سُوجھی۔ وہ بُوڑھے کو لے کر دریائے راوی پر آ گیا۔ بابا نے پُوچھا "اِدھر کیا کرنے آئے ہو؟"

حاتم بولا "ذرا دریا میں نہانا چاہتا ہوں"
بوڑھا شور مچاتا رہا مگر حاتم دریا میں اُتر گیا۔ مصیبت یہ تھی کہ حاتم تو گردن تک پانی میں ڈوب چکا تھا، مگر بوڑھا بڑے مزے سے اُس کی گردن پر بیٹھا دریا کی سیر کر رہا تھا۔ آخر حاتم کو ایک اور ترکیب سُوجھی۔ اگرچہ اس میں اس کے اپنے ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن اُس نے اپنی جان کا خطرہ مول لے لیا اور سانس روک کر دریا میں ڈبکی لگا دی۔ جب اُس کا سانس گھُٹنے لگا تو وہ اُوپر آ گیا۔ بوڑھا بھی غوطے کھا کھا کر نڈھال ہو گیا تھا۔ لیکن اُس نے ہنس کر کہا:

"میں مر جاؤں گا، مگر تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔"

حاتم طائیؔ نے ایک بار پھر غوطہ لگایا اور اس بار کافی دیر تک پانی میں رہا۔ اب بوڑھے نے حاتم کی گردن چھوڑ دی۔ حاتم پانی کی سطح پر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ بوڑھا مزے سے تیرتا ہُوا کنارے کی طرف جا رہا ہے۔ حاتم کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ بڑی مُشکل سے ہاتھ پاؤں مار کر کنارے پر پہنچا۔ کنارے پر آ کر اُس نے سانس دُرست کیا

ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ وہی بُوڑھا ریت پر رینگتا ہُوا اُس کی طرف چلا آ رہا ہے۔ حاتِم نے ایک چیخ ماری اور سر پر پاؤں رکھ کر شہر کی طرف بھاگا۔ اب وہ نیکی کر دریا میں ڈال کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

وہ بھاگم بھاگ دہلی دروازے گیا۔ وہاں وہی نوجوان ابھی تک لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنا سوال دُہرا رہا تھا۔ حاتِم نے اُس سے کہا:

"بھائی، مُجھے تُمھارے سوال کا جواب مِل گیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ جو تُمھارے ساتھ نیکی کرے، اُس کی گردن پر سوار ہو جاؤ۔"

یہ سُن کر نوجوان بُہت خُوش ہُوا اور ناچتا ہُوا لنڈے بازار کی طرف بھاگ گیا۔ حاتِم طائی کو خطرہ تھا کہ کہیں وہی بُوڑھا وہاں نہ آ جائے۔ وہ بھی ایسا بھاگا کہ چوک لکشمی میں آ کر دم لیا۔

حاتِم پھنس گیا!

چوک لکشمی کے مُحلّے میں ایک گھر شیخ رُستم علی

کا تھا۔ شیخ رُستم کے چھوٹے بھائی شیخ حاتم علی کویت میں تجارت کرتے تھے اور اُن کے دماغ کا ایک پیچ ذرا ڈھیلا تھا۔ آج وہ کویت سے لاہور آ رہے تھے۔ شیخ رُستم نے اپنے بیٹوں عمران اور زاہد سے، جو آٹھویں اور نویں جماعت میں پڑھتے تھے، کہا کہ وہ ایئر پورٹ شیخ حاتم کو لینے جا رہے ہیں، لیکن چوں کہ ان کے دماغ کا ایک پُرزہ ذرا ڈھیلا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ ہوائی اڈّے سے اکیلے ہی گھر کی طرف چل پڑیں۔ اگر وہ یہاں آ جائیں تو اُن کی خُوب آؤ بھگت کرنا اور گھر میں عزّت سے بٹھانا۔

"تُم نے اپنے چچا کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔ وہ لمبے سے، دُبلے سے ہیں، عربی لباس پہنتے ہیں اور کمر میں تلوار لٹکائے رکھتے ہیں۔ ہر بات پر "شکریہ، میں حاتم ہوں" کہتے ہیں اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، لیکن تُم انھیں اس وقت تک بٹھائے رکھنا جب تک میں نہ آ جاؤں، ورنہ وہ فوراً واپس چلے جائیں گے۔"

زاہد اور عمران نے کہا "آپ بالکل فکر نہ کریں۔

انکل حاتم یہاں آ گئے تو ہم انھیں ہرگز باہر نہیں جانے دیں گے۔"

"شاباش! اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ جہاز کا وقت ہو گیا ہے۔"

شیخ رستم رکشا لے کر سیدھے ہوائی اڈّے پر آ گئے۔ یہاں وہی ہُوا جس کا انھیں ڈر تھا۔ جہاز پہلے ہی آ چُکا تھا، اور شیخ حاتم کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

زاہد اور عِمران اس خیال سے کہ ان کے چچا حاتم کہیں اِدھر اُدھر مکان کی تلاش میں نہ گھوم پھر رہے ہوں، چوک لکشمی میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ اتفاق سے اُدھر حاتم طائیؔ کا گزر ہُوا۔ اب جو زاہد کی نظر ایک عربی لباس والے آدمی پر پڑی، جس نے کمر میں تلوار لٹکا رکھی تھی، تو چونک کر عِمران سے کہا:

"عِمران! وہ دیکھو! مجھے تو انکل حاتم لگتے ہیں۔"

عِمران نے حاتم طائیؔ کو دیکھا تو بولا "تمھارا خیال دُرست ہے۔ وُہی عربی لباس اور ویسی ہی تلوار۔ چلو، انھیں گھر لیے چلتے ہیں۔"

زاہد نے کہا "جلدی کرو۔ کہیں وہ اِدھر اُدھر

نہ ہو جائیں۔ اُن کا دماغ جو ٹھیک نہیں۔ کیا خبر کس طرف کو چل دیں۔"

زاہد اور عمران بھاگ کر حاتم طائیؒ کے پاس گئے اور کہا "کیا آپ کا نام حاتم ہے؟"

حاتم طائیؒ بڑا خوش ہوا کہ یہ لڑکے اُسے جانتے ہیں۔ جھٹ بولا "شکریہ، شکریہ کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔ میں حاتم ہی ہوں۔"

"شکریہ شکریہ" کے لفظوں پر زاہد نے عمران کو آنکھ سے اِشارہ کیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ یہی چچا حاتم علی ہیں جن کو لینے اُن کے ابُّو ائیرپورٹ گئے ہیں۔

عمران نے حاتم طائیؒ سے ہاتھ ملایا اور کہا "انکل، آپ سے مِل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آئیے، ہمارے ساتھ چلیے۔ ابُّو آپ ہی کی تلاش میں گئے ہیں۔ بس آ ہی رہے ہوں گے۔"

حاتم طائیؒ نے کان کھجاتے ہوئے کہا "میری تلاش میں گئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ گھر چلیے۔ وہ وہیں آ جائیں گے۔"

حاتم طائی نے سوچا، ہو سکتا ہے ان کے ابّو پر بھی کوئی مصیبت آن پڑی ہو اور وہ حاتم طائی کی مدد چاہتے ہوں۔ چنانچہ وہ زاہد اور عمران کے ساتھ اُن کے گھر آ گیا۔ دونوں بھائیوں نے اُسے دیوان خانے میں بٹھا دیا۔ اُن کی امّی کوہ مری اپنی امّی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ زاہد نے عمران کے کان میں کہا:

"جلدی سے شربت اور مٹھائی لا کر انکل کے آگے رکھ دو۔ اس طرح وہ کھانے میں لگ جائیں گے اور اتنی دیر میں ابّو آ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے" عمران نے جواب دیا اور لپک کر فرج میں سے مٹھائی کی پلیٹ نکال کر حاتم طائی کے آگے رکھ دی۔

حاتم اُن کی مہمان نوازی سے خوش ہو کر بولا "شکریہ، شکریہ، مگر بچّو، میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ مجھے ابھی لاہور شہر کے لوگوں کی مدد کرنی ہے۔"

زاہد اور عمران نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ اب انھیں یقین ہو گیا کہ یہی ان کے چچا شیخ حاتم علی ہیں جن کے دماغ کا کوئی

پُرزہ ڈھیلا ہے۔ عمران نے اِشارے سے زاہد کو باہر بُلایا اور کہا :

"یہی ہمارے چچا شیخ حاتم ہیں۔ اب جب تک ابُّو نہ آ جائیں، انھیں گھر میں بٹھائے رکھنا ہے۔"

"بالکُل، بالکُل۔ ہم انھیں ہرگز باہر نہیں جانے دیں گے۔"

یہ طے کر کے دونوں جلدی سے کمرے میں آ گئے۔ حاتم طائی اس وقت مِٹھائی کی ایک ڈلی کھا رہا تھا۔ اُس نے کہا :

"بڑے مزے کی مِٹھائی ہے۔ عرب میں ایسی عُمدہ مِٹھائی نہیں بنتی۔"

"عرب سے آپ کی مُراد کویت ہے کیا ؟" عِمران نے پُوچھا۔

"کویت ؟ وہ کیا ہوتا ہے ؟" حاتم نے تعجُّب سے پُوچھا۔

زاہد نے عِمران کے کان میں آہستہ سے کہا "کویت کے بارے میں کُچھ نہ پُوچھو۔ کہیں انکل پر دورہ نہ پڑ جائے۔"

عِمران ہنس کر کہنے لگا " انکل، اور مِٹھائی

کھائیں نا۔"

"شکریہ، شکریہ۔ اب میں چلتا ہوں۔"

زاہد اور عمران گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "نہیں نہیں، انکل۔ ابھی نہیں۔ کچھ دیر تو ٹھہریں۔ ابّو آ ہی رہے ہوں گے۔"

حاتم طائی نے بڑی شفقت سے کہا "بچّو، تمھارے ابّو سے پھر کبھی مل لوں گا۔ اب میں جانا چاہتا ہوں۔"

عمران نے جلدی سے حاتم طائی کے گلاس میں شربت ڈال دیا اور کہا "انکل، یہ شربت تو پی لیں۔"

"اچھّا بیٹا، تمھاری خاطر پی لیتا ہوں، ورنہ پیاس تو بالکل نہیں ہے۔"

عمران نے سوچا کہ جب تک ابّو نہیں آ جاتے، چچا حاتم کو باتوں میں لگائے رکھنا چاہیے۔ اُس نے پوچھا:

"انکل، آپ نے حاتم طائی کی کہانیاں پڑھی ہیں؟"

حاتم نے اپنی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا "تمھیں یقین نہیں آئے گا، مگر وہ حاتم طائی میں

ہی ہُوں۔"

زاہد اور عمران نے ایک دُوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب انکل حاتم کے پاگل ہونے میں کیا شک باقی ہے۔ یہ اپنے آپ کو وہ شخص ظاہر کر رہے ہیں جسے مرے سینکڑوں برس گزر چکے ہیں۔ زاہد نے بات کو آگے بڑھانے کے خیال سے کہا:

"انکل، کیا سچ مچ آپ حاتم طائی ہیں؟"

حاتم طائی ہنسنے لگا "ہاں بیٹا۔ یقین کرو کہ میں ہی وہ حاتم طائی ہُوں جس کے مُتعلّق تم نے کہانیوں میں پڑھا ہے کہ وہ بے حد سخی تھا اور ہر حاجت مند کی حاجت پُوری کرتا تھا۔"

عمران نے حاتم طائی سے ہاتھ ملاتے ہُوئے کہا "انکل حاتم طائی، آپ سے مل کر بڑی خُوشی ہُوئی۔ آپ میرے سکُول ضرُور آیئے۔ میرے دوست آپ سے مل کر بڑے خُوش ہوں گے۔"

حاتم طائی نے پُوچھا کہ وہ کون سے سکُول میں پڑھتا ہے تو زاہد نے کہا "انکل، ہم دونوں ایک ہی سکول میں پڑھتے ہیں، اور ہمارے سکُول کا

نام ہے، اے بی سی سکول۔"
حاتم طائی نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا "یہ اے بی سی کیا بلا ہے؟"
عمران بولا "یہ انگریزی کی الف ب ت ہے، انکل۔"
حاتم طائی اور زور زور سے سر کھجانے لگا۔ پھر اپنا جبّہ سنبھالتے ہوئے بولا "اچھا بچّو، تمھاری میزبانی کا بہت بہت شکریہ، اب میں جا رہا ہوں۔"
یہ سن کر زاہد اور عمران یوں اچھل پڑے جیسے ان کے پاؤں کے نیچے مینڈک آ گیا ہو۔ عمران نے جلدی سے کہا:
"نہیں نہیں، انکل۔ ابھی نہ جائیں۔ ابّو آپ سے نہ ملے تو انھیں بڑا افسوس ہوگا۔"
"بیٹا، مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ پھر کبھی آ جاؤں گا۔ شکریہ، تمھارا بہت بہت شکریہ۔"
زاہد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "انکل، میں آپ کو عرب کی ایک کتاب دکھاتا ہوں۔"
"اچھّا چلو، تمھاری خاطر یہ کتاب دیکھ لیتا ہوں۔ جلدی سے لاؤ" حاتم بولا۔

زاہد نے الماری میں سے تاریخ کی ایک کتاب نکال کر حاتم طائیؔ کو دی اور حاتم کتاب کے ورق اُلٹنے لگا۔ زاہد عمران کو اشارے سے برابر والے کمرے میں لے گیا۔

"اب کیا کریں؟" عمران نے گھبرا کر کہا "انکل چلے گئے تو پھر انھیں کہاں تلاش کرتے پھریں گے؟ خُدا کے لیے کچھ کرو۔"

زاہد نے کہا "میرے دماغ میں تو بس ایک ہی تدبیر آئی ہے۔"

"کیا؟" عمران نے پُوچھا۔

زاہد نے اُسے بتایا کہ جس ڈرائنگ رُوم میں انکل حاتم بیٹھے ہیں، اس کا دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا جائے۔

"اور کھڑکی جو کُھلی ہے۔ اُس کا کیا کریں گے؟" عمران بولا۔

زاہد نے کہا "تُم بھُول گئے ہو کہ کھڑکی میں سلاخیں لگی ہُوئی ہیں۔"

"اوہ! آئی ایم سوری۔"

زاہد بولا "میرے ذہن میں بس یہی ایک ترکیب

ہے اور اس پر عمل کر کے ہم انکل کو روک سکتے ہیں۔ وہ آدھے پاگل ہیں۔ کیا خبر کس وقت اُٹھ کر یہاں سے فرار ہو جائیں۔"

"تو پھر چلو، بسم اللہ کرتے ہیں" عمران نے کہا "مگر دروازہ تم بند کرو گے۔"

"فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دونوں ڈرائنگ رُوم میں آ گئے، جہاں حاتِم طائی شربت کا گلاس خالی کر چکا تھا اور ساتھ ہی اُس نے عرب کی تصویروں والی کتاب بھی دیکھ لی تھی۔ وہ جمائی لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا:

"اچّھا بھئی بچّو، تُمھارا شُکریہ۔ اب ہم چلے۔"

اس کا اِتنا کہنا تھا کہ زاہد اور عمران بجلی کی سی تیزی سے باہر آئے اور ڈرائنگ رُوم کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ حاتِم طائی ہکّا بکّا رہ گیا کہ یہ ان لڑکوں نے کیا حرکت کی! اُس نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہُوئے کہا:

"تُم نے مجھے قید کیوں کر دیا ہے؟ دروازہ کھولو۔ میں باہر جانا چاہتا ہُوں۔"

مگر زاہد اور عمران نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ

دروازے پر کھڑے اپنی کامیابی پر کھی کھی کرتے رہے۔
حاتِم طائیؒ نے دروازہ کُوٹنا شرُوع کیا تو وہ وہاں سے بھاگ کر باہر چلے گئے اور اپنے ابّو کا اِنتظار کرنے لگے۔ حاتِم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان لڑکوں نے اُسے کمرے میں کس لیے بند کر دیا ہے؟ وہ دروازہ پیٹ پیٹ کر تھک گیا تو کھڑکی کے پاس آ کر آوازیں دینے لگا، مگر وہاں تو جیسے ہمسائے بھی سو رہے تھے۔

آخر وہ تھک ہار کر کُرسی پر بیٹھ گیا اور اُس وقت کو کوسنے لگا جب اُس نے ان لڑکوں کی دعوت قبول کی تھی۔ مگر اُس کا دماغ وہاں سے بھاگنے کی ترکیبیں برابر سوچ رہا تھا۔

چھت کی طرف اُس کی نگاہ گئی تو کیا دیکھتا ہے کہ اُوپر ایک روشن دان ہے، جس میں نہ کوئی جالی ہے اور نہ سلاخیں۔ اُس نے بڑی میز پر ایک چھوٹی میز رکھی، پھر اُس کے اُوپر کُرسی رکھ کر اُوپر چڑھا اور روشن دان میں پُہنچ گیا۔ روشن دان اتنا کُھلا تھا کہ وہ بڑی آسانی سے اُس میں سے نِکل سکتا تھا۔ لیکن یہ اُس نے سوچا ہی نہ تھا کہ

دُوسری طرف کس کا گھر ہے، اور دیوار کتنی اُونچی ہے۔ اُس کو تو ایک ہی لگن لگی تھی کہ کسی طرح اِس قید سے رہائی مِلے۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ یہ ساتھ والے مکان کا صحن تھا۔ اُس نے اُدھر ہی چھلانگ لگا دی۔

چھلانگ لگاتے ہی وہ اُٹھا اور باہر بھاگنے ہی لگا تھا کہ مالک مکان اور اُس کے دو بیٹوں نے اُسے پکڑ لیا اور چور چور کا شور مچانے لگے۔ سارا محلّہ اکٹھّا ہو گیا۔ حاتم نے بہتیرا کہا کہ میں چور نہیں ہُوں، حاتم طائی ہُوں اور میرے دستر خوان پہ ہر روز پچاس ساٹھ آدمی کھانا کھاتے تھے، بھلا میں کیوں چوری کرنے لگا، مگر مالکِ مکان نے ایک نہ مانی اور چیخ کر کہا:

"پولیس کو بُلاؤ! پولیس کو بُلاؤ!"

شور سُن کر عِمران اور زاہد بھی وہاں آ گئے۔ اُنھوں نے اپنے انکل حاتم کو مُصیبت میں پھنسے دیکھا تو گھبرا گئے۔ اُنھوں نے کہا، یہ تو ہمارے انکل ہیں اور کویت سے آئے ہیں۔ یہ چور نہیں ہیں۔

"چور نہیں ہیں تو میرے گھر میں چھلانگ کس

خوشی میں لگائی ہے اِنھوں نے ؟" مالکِ مکان نے غُصّے سے کہا۔

اِتنے میں عِمران اور زاہد کے ابُّو بھی وہاں پہنچ گئے۔ اِنھیں دیکھتے ہی عِمران نے بلند آواز سے کہا " ابّو، یہ لوگ ہمارے انکل کو تھانے لے جا رہے ہیں۔"

عِمران کے ابُّو نے غور سے حاتِم طائیؔ کو دیکھا اور کہا " ارے ! یہ تُمھارے انکل کہاں ہیں ؟"

اب تو عِمران اور زاہد بڑے پریشان ہوئے۔ اُنھوں نے تو یہ سارا ڈراما حاتِم طائیؔ کو انکل شیخ حاتِم علی سمجھ کر کھیلا تھا۔ زاہد نے پُوچھا :

" یہ ہمارے انکل شیخ حاتِم علی نہیں ہیں ؟"

" یہ تو خُدا جانے کون شریف آدمی ہے" ابّو نے ہنس کر کہا۔

حاتِم طائیؔ نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہُوئے کہا " میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مگر بھائی صاحب، مجھے یہ غلط فہمی بڑی مہنگی پڑی۔"

زاہد کے ابُّو نے پُوچھا " لیکن آپ ہیں کون ؟"

حاتِم طائیؔ نے اپنا تعارُف کرایا تو وہاں جتنے

لوگ کھڑے تھے، وہ سب کھِل کِھلا کر ہنس پڑے۔ زاہد اور عِمران نے حاتِم طائی سے مُعافی مانگی ، اور ہم سائے سے کہ سُن کر اس کی جان چھُڑائی ۔

حاتِم طائی نے خُدا کا شُکریہ ادا کیا اور سر پر پاؤں رکھ کر ایسا بھاگا کہ گڑھی شاہو ہیں آ کر ہی دم لیا۔ یہاں اچانک اُس کی نظر ایک اُونٹ پر پڑی جو ایک بوجھ ڈھونے والی گاڑی سے بندھا ہُوا جُگالی کر رہا تھا۔

اُونٹ کو دیکھ کر حاتِم طائی کو اپنا وطن عرب یاد آ گیا۔ وہ لپک کر اُس کی طرف بڑھا۔ اُونٹ نے حاتِم طائی کو دیکھا تو پہلے ہنس پڑا اور پھر رونے لگا۔ حاتِم طائی نے اُونٹ کو گلے لگایا اور پُوچھا :

"بھائی اُونٹ ، یہ بتاؤ کہ تُم مجُھے دیکھ کر پہلے ہنسے کیوں ، اور پھر رونے کیوں لگے ؟"

اُونٹ نے کہا "اے میرے عزیز، تجُھے دیکھ کر ہنسا اس لیے کہ ایک مُدّت کے بعد اپنا ایک ہم وطن نظر آیا، اور رو دیا اس لیے کہ تیری حالت مجُھے بہُت پتلی دِکھائی دے رہی ہے۔"

حاتِم طائی نے آہ بھر کر کہا "میرے عزیز، تُم

سچ کہتے ہو۔ جب میں اس شہر میں آیا تھا تو میری حالت موٹی تھی، مگر یہاں لوگوں کے سوال پُورے کرتے کرتے بہُت پتلی ہو گئی ہے۔ اب تو میں خُود ایک سوال بن کر رہ گیا ہوں۔ اچھّا، یہ بتاؤ کہ تُم کِس چیز کی جُگالی کر رہے ہو کہ تمھُارے ہونٹ لال ہو رہے ہیں؟"

اُونٹ نے مُسکراتے ہُوئے کہا "پیارے حاتِم طائی، میں تمباکو والا پان چبا رہا ہُوں۔ یہاں لاہور آ کر مجھُے اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ تُم کھاؤ گے؟ میرے کوہان میں ایک تھیلی پڑی ہے، جس میں دو پان رکھے ہیں۔"

حاتِم طائیؔ نے کہا "شُکریہ، بھائی اونٹ۔ میں ابھی تک اس بُری عادت سے بچا ہُوا ہُوں۔"

اِتنے میں اُونٹ گاڑی کا مالک آ گیا۔ اُس نے جو حاتِم طائیؔ کو اُونٹ کے قریب کھڑے دیکھا تو چابک لہرا کر بولا "کیوں میاں، اُونٹ چُرانے کا اِرادہ ہے کیا؟"

حاتِم طائیؔ نے کہا " اے بھائی گاڑی والے، عرب میں میرے پاس ایک سو اُونٹ تھے۔ میں چور نہیں

ہوں۔ حاتم طائی ہوں۔"

گاڑی والے نے کہا "تو پھر حاتم طائی جی، ذرا پرے ہٹ جاؤ۔ میں گاڑی جوتنے لگا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اُس نے زور سے اُونٹ کے چابک مارا تو وہ بلبلا کر چیخا "ارے ظالم! ذرا تو ہلکا ہاتھ مارا کر!"

اُونٹ گاڑی آگے نکل گئی تو حاتم نے بھی اپنا رستہ لیا۔ وہ گڑھی شاہو سے کوئین میری کالج کی طرف آ رہا تھا کہ ایک سفید ڈاڑھی والے بُزرگ کو آنسو بہاتے دیکھا۔ اُس نے بُزرگ کے قریب جا کر پُوچھا:

"میاں جی آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟"

میاں جی نے حاتم طائی کو دیکھ کر ایک چیخ ماری اور پھر کہا "ایک بار دیکھی ہے، دُوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے!"

حاتم طائی نے چونک کر کہا "میاں جی، وہ کون سی شے ہے جو آپ نے ایک بار دیکھی ہے اور دُوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے؟"

بُزرگ نے حاتم طائی کی طرف اُمّید بھری نظروں

سے دیکھ کر کہا "اے عزیز، میری بچّی نویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ اس کا امتحان سر پر ہے، مگر سائنس کی کتاب کہیں نہیں مِل رہی۔ بس ایک بار دیکھی تھی۔ دُوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ اگر تم کہیں سے میری بچّی کو یہ کتاب لا دو تو میں ساری عُمر دُعائیں دُوں گا۔"

حاتم طائیؔ نے بڑے میاں کو تسلّی دی، گھر کا پتا لیا اور سائنس کی کتاب کی تلاش میں اُردو بازار کی طرف روانہ ہُوا۔

اُردو بازار میں کوئی بھی اُردو نہیں بول رہا تھا۔ دکانوں پر نئی پُرانی کتابوں اور کاپیوں کے انبار لگے تھے، مگر طالب عِلم مارے مارے پھر رہے تھے۔ کیوں کہ جس کتاب کی انھیں تلاش تھی وہ نہیں مِل رہی تھی۔ حاتم طائیؔ نے ایک دُکان دار سے سائنس کی کتاب مانگی تو اُس نے سر سے پاؤں تک اس کو دیکھا، اور پھر ہنس کر کہا:

"تُم بغدادی چور تو نہیں ہو؟ جاؤ میاں، اپنا راستہ لو۔ یہ کتاب تو قیامت تک تُمھیں نہیں مِل سکتی۔"

حاتم دُوسری دکان پر گیا تو وہاں بھی دکان دار

نے سر ہلا کر کہا "نہ نہ۔ بھائی صاحب، یہ کتاب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ ہاں، بازار کی خاک چھان کر دیکھ لو۔ شاید کہیں سے مل جائے۔"

حاتم طائی نے جھٹ ایک دکان سے چھلنی خریدی اور اُردو بازار کی خاک چھاننے لگا۔ ایک شخص نے پُوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے تو اُس نے آہ بھر کر جواب دیا:

"خاک چھان رہا ہُوں کہ سائنس کی کتاب مل جائے۔"

وہ شخص کِھل کِھلا کر ہنس پڑا اور بولا "ارے بھائی، کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جاؤ، گھر جا کر آرام کرو۔ یہ کتاب تو تمھیں قیامت تک نہیں مِلے گی۔"

حاتم طائی آہ و زاری کرتا ہُوا اُردُو بازار سے چلا آیا۔ جب وہ ایک سکول کے پاس پُہنچا تو کیا دیکھتا ہے، ایک عورت سر پر ہاتھ رکھے دہاڑیں مار مار کر رو رہی ہے۔ حاتم نے اس کے پاس جا کر پُوچھا:

"بہن، تُم کیوں رو رہی ہو؟ مجُھے بتاؤ، تمھیں

کیا دُکھ ہے اور میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہُوں؟
میرا نام حاتم طائی ہے۔ میں نے ہمیشہ دُکھی اِنسانوں کی
خدمت کی ہے۔"

عورت نے گردن ہلائی اور دہاڑیں مارتے ہُوئے
بولی "نہیں بھائی۔ اگر اللہ دین کے چراغ کا جِن بھی
آ جائے تو میرا دُکھ دُور نہیں کر سکتا۔"

حاتِم طائی نے کہا "بہن، ایسا کون سا دُکھ
ہے جسے اللہ دین کے چراغ کا جن بھی دُور نہیں
کر سکتا؟ بتاؤ تو سہی۔ شاید میں تمھاری مُشکل حل
کر سکوں۔"

عورت نے کہا "تو پھر سُنو! میرے بیٹے کو
اس سکول میں داخلہ دِلا دو۔"

حاتِم نے مُسکرا کر کہا "بہن، بھلا یہ بھی کوئی مُشکل
کام ہے۔ میں ابھی ہیڈ ماسٹر صاحِب سے مِل کر
تُمھارے بیٹے کو داخل کرائے دیتا ہُوں۔"

یہ کہہ کر حاتِم سکُول کے اندر گیا تو وہاں حشر
برپا تھا۔ کوئی رو رہا تھا، کوئی ہنس رہا تھا۔ حاتِم
نے ایسا نظارہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اُس
عورت کے بیٹے کے داخلے کے لیے ہیڈ ماسٹر

کے کمرے کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ دروازے کے باہر، برآمدے میں، ایک بہت بوڑھا اور کمزور شخص دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ اس کی ڈاڑھی کے سفید بال سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ جسم کی ہڈّیاں نکل آئی تھیں۔ کمزور سی گردن پہ کھوپڑی آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ لوگ اُسے دیکھ کر عبرت پکڑتے اور آگے نکل جاتے۔ حاتم نے اس بوڑھے کھوسٹ کے قریب جا کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں بیٹھا کیوں رو رہا ہے، تو اُس کے ڈھانچے میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور اُس نے بے حد کمزور آواز میں کہا :

"بھائی میں سکول میں داخلہ لینے آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا کہ انتظار کرو۔ تب سے انتظار کر رہا ہوں۔"

حاتم طائی ایک بار پھر سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ اُٹھا۔

حاتم طائی پاگل خانے میں

حاتم طائی چیرنگ کراس میں آیا تو ایک سپاہی نے سیٹی بجا کر اُسے روک لیا۔ وہ بڑا حیران ہُوا کہ آخر اس شخص نے اُسے کس لیے روکا ہے! سپاہی نے اُس کی کمر میں لٹکی ہُوئی تلوار کی طرف اشارہ کیا اور پُوچھا:

"اِس کا لائسنس آپ کے پاس ہے، جناب؟"

حاتم طائی نے پُوچھا کہ لائسنس کیا ہوتا ہے تو سپاہی اُسے تھانے لے گیا۔ تھانیدار نے سر سے پاؤں تک حاتم طائی کو دیکھا اور پوچھا "آپ کون ہیں؟"

حاتم طائی نے اپنا نام بتایا تو تھانیدار اور سارے سپاہی ہنس پڑے۔ پھر تھانیدار نے سپاہی سے کہا "ارے میاں، اسے چار نمبر بس میں سوار کرا دیا ہوتا۔ یہاں کیوں لے آئے؟"

حاتم طائی نے پُوچھا "چار نمبر بس کہاں جاتی ہے، بھائی؟"

تھانیدار نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا :
"ابھی آپ کو اُس میں سوار کرا دیتے ہیں۔ پھر اپنے آپ پتا چل جائے گا کہ یہ بس کہاں جاتی ہے۔ ابھی تو آپ یہ تلوار یہاں جمع کرا دیں، کیوں کہ اسلحہ لے کر چلنا جُرم ہے۔ ہم آپ کو اس لیے مُعاف کرتے ہیں کہ آپ برادر اسلامی مُلک سے آئے ہیں۔"

حاتم طائی کی تلوار تھانے میں جمع کر کے اُسے رسید دے دی گئی اور ایک سپاہی نے اُسے چار نمبر بس میں سوار کروا دیا۔ ساتھ ہی کنڈکٹر کو تاکید کر دی کہ اُسے پاگل خانے کے سٹاپ پر اُتار دیا جائے۔

جب بس پاگل خانے کے پاس پہنچی تو کنڈکٹر نے حاتم کو وہاں اُتار دیا۔ سامنے ایک قلعہ نما عمارت تھی جس کے دروازے میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ حاتم نے سوچا کہ ضرور یہ کسی بادشاہ کا محل ہے۔ چل کر بادشاہ سے ملنا چاہیے۔ وہ دروازے کی چھوٹی کھڑکی میں سے گزر کر اندر چلا گیا۔ بائیں جانب ایک دفتر تھا۔ حاتم دفتر میں داخل ہُوا تو ایک صاحب نے پُوچھا "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

حاتم طائی نے کہا "مجھے اس محل کے بادشاہ سلامت

سے ملنا ہے۔"

اس جواب پر دفتر کے لوگوں کو کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ افسر نے پوچھا "آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے؟"

حاتم نے کہا "میں عرب سے اکیلا ہی چلا تھا۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟" افسر نے پوچھا۔

"میرا نام حاتم طائی ہے۔"

اس پر وہ لوگ ذرا مسکرائے۔ افسر نے کہا "اندر تشریف لے چلیے۔ باہر کیوں کھڑے ہیں؟"

حاتم طائی اُن لوگوں کی مہمان نوازی سے بہت خوش ہوا، اُن کا شکریہ ادا کیا اور بولا "کیا اندر بادشاہ سلامت سے ملاقات ہوگی؟"

افسر مسکرا کر بولا "فکر نہ کریں۔ اندر کئی بادشاہ ہیں، کئی حاتم طائی اور الٰہ دین کے چراغ کے جن ہیں۔ آپ تشریف لے چلیے۔"

یہ بات حاتم کی سمجھ میں نہ آئی۔ بہرحال، وہ ایک چپڑاسی کے ساتھ عمارت کے برآمدے میں سے گزر کر دوسری طرف چل دیا۔ سامنے کئی چھوٹے چھوٹے کمرے تھے، جن کے دروازے پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں، اور ہر کمرے کے اندر ایک پاگل بند تھا

جو حاتم کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ حاتم نے چپڑاسی سے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں بھائی، اور انھیں کوٹھریوں میں کیوں بند کر دیا گیا ہے؟"

چپڑاسی نے کہا "اے حاتم، ان میں سے کوئی رابن ہڈ ہے، کوئی بادشاہ اور کوئی وزیر ہے۔ کئی حاتم طائی بھی ہیں۔"

"کیا کہا؟ حاتم طائی بھی ہیں؟ حاتم طائی تو صرف میں ہوں۔"

چپڑاسی نے کہا "آپ تو اصلی حاتم طائی ہیں نا۔ مگر یہ بھی آپ سے کم نہیں ہیں۔ آپ ان سے ملیں گے تو طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔ آئیے، اندر تشریف لے چلیے۔"

یہ کہہ کر چپڑاسی نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں، بنچ پر، ایک پاگل اکڑوں بیٹھا دیوار کو گھور رہا تھا۔ حاتم اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ چپڑاسی نے دروازہ بند کر کے تالا ڈال دیا۔ اب تو حاتم بڑا گھبرایا۔ سمجھ گیا کہ اُس کے خلاف کوئی سازش ہوئی ہے۔ اِتنے میں دیوار کو گھورنے والے پاگل نے قہقہہ مار کر کہا:

"شاباش بہادرو! قلعے کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو جاؤ۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

حاتم طائی نے تعجب سے اُس پاگل کی طرف دیکھا اور کہا "بھائی، تُم کس قلعے کی بات کر رہے ہو؟"

پاگل نے پلٹ کر حاتم کو دیکھا اور دیوار کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے بولا "وہ دیکھو! سامنے یُونان کا قلعہ ہے اور میری فوجیں اس کی دیوار پر چڑھ رہی ہیں۔"

حاتم طائی نے پُوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟"

پاگل نے ایک قلابازی لگائی اور اپنا ہاتھ ران پر مار کر بولا "تُم مجھے نہیں جانتے؟ میں چنگیز خان کا بیٹا ہلاکُو خان ہُوں۔ کیا تُم بغدادی چور ہو؟"

حاتم نے کہا "نہیں بھائی۔ میں حاتم طائی ہُوں۔ عرب کا رہنے والا ہُوں۔ تُم نے میرا نام ضرُور سُنا ہوگا۔ قسمت کے چکّر میں پھنس کر اِدھر آ نِکلا ہُوں۔"

پاگل زور سے قہقہہ مار کر بولا "بہُت خُوب! مسٹر حاتم طائی، تُم سے مِل کر بہُت افسوس ہُوا۔

اچھا، لو مُرغ کی یخنی پیو۔ میں نے ہاتھی کی یخنی بھی تیار کی تھی، مگر وہ میری ساری فوج پی گئی"۔

اور اِس کے ساتھ ہی پاگل ہاتھوں کا چُلّو بنا کر حاتم کے مُنھ کے پاس لایا اور بولا "لو پیو، میرے بغدادی چور"۔

اب حاتم سمجھا کہ لوگوں نے اُسے پاگل سمجھ کر یہاں بند کر دیا ہے۔ مگر وہ بالکل نہ گھبرایا، بلکہ عقل سے کام لے کر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اس مُصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرے۔ اُس نے جھُوٹ مُوٹ پاگل کے چُلّو میں سے مُرغی کی یخنی پی لی۔ پاگل اپنے خالی چُلّو کو دیکھ کر بولا:

"ارے! میرے چُلّو میں تو کُچھ بھی نہیں تھا۔ پھر تُم نے یخنی کہاں سے پی؟ ٹھیک ہے۔ اب ثابت ہو گیا کہ تُم بھی میری طرح پاگل ہو"۔

حاتم طائی گڑبڑا سا گیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ تو کوئی ہوش مند لگتا ہے۔ اُس نے پاگل سے کہا "کیا تُم پاگل نہیں ہو؟"

پاگل نے بڑی رازداری سے کہا "میں پاگل نہیں ہُوں۔ میں بالکل پاگل نہیں ہُوں۔ میں تو پاگلوں

کی جاسوسی کرنے یہاں آیا ہوں۔"

اب حاتم طائی کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص واقعی پاگل نہیں ہے۔ اُس نے کہا "لیکن تم اپنے آپ کو ہلاکو خان کیوں کہتے ہو؟"

پاگل نے ہنس کر کہا "کسی کو بتانا مت۔ میں ہلاکو خان نہیں بلکہ چنگیز خان ہوں۔"

اور یہ کہہ کر وہ ہنسنے، اُچھلنے اور قلابازیاں لگانے لگانے لگا۔ حاتم سر پکڑ کر لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ یہ شخص واقعی پاگل تھا۔ اب تو اس پاگلوں کے بھوت محل سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس میں پاگل خانے والوں کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ حاتم طائی اور اُن کے درمیان ایسی باتیں ہوئی تھیں کہ انھوں نے اُسے پاگل سمجھ لیا۔ ویسے بھی اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ میں حاتم ہوں تو ایک بار تو آپ بھی سوچنے لگیں گے کہ اس شخص کا کوئی پُرزہ تو ڈھیلا نہیں ہے۔ اس لیے حاتم طائی نے پاگل خانے والوں کو الزام نہ دیا۔ بلکہ اُس نے دیکھا کہ شفاخانے کے ڈاکٹر اور افسر مریضوں کا کافی خیال رکھتے ہیں اور اُن کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے ہیں۔

حاتم نے افسر کو پیغام بھجوایا کہ میں پاگل نہیں ہُوں۔ مجھے باہر نِکالا جائے۔ مگر افسر بے چارہ اُسے باہر نِکال کر شہر کے لوگوں کی جان و مال کا خطرہ کیوں کر مول لے سکتا تھا۔ اُسے تو یقین تھا کہ حاتِم طائی دیوانہ ہے۔

سارا دِن حاتِم وہاں سے فرار کے منصوبے سوچتا رہا۔ کھانا اُسے کوٹھڑی میں ہی دیا گیا۔ اُس کا ساتھی پاگل کھانے کی پلیٹ لے کر اُس کے پاس آیا اور بولا :

"میں اس پلیٹ میں اپنی فوجوں کو یونانیوں کے خلاف جنگ کرتے دیکھ رہا ہُوں۔ کیا تُم بھی دیکھ رہے ہو؟"

حاتِم طائی نے سر پکڑ لیا۔ پھر پلیٹ کی طرف دیکھ کر بولا "مجھے تو اس میں سوائے چاولوں کے اور کُچھ دِکھائی نہیں دے رہا۔"

پاگل نے مُسکرا کر کہا "مجھے بھی سوائے چاولوں کے اور کُچھ دِکھائی نہیں دے رہا۔"

"مگر ابھی تو تُم کہہ رہے تھے کہ تمھاری فوجیں یُونان کی فوجوں سے جنگ کر رہی ہیں؟"

پاگل نے چاول کھاتے ہوئے کہا "پاگل ہو گئے ہو؟ میں نے یہ کب کہا تھا؟ اور اگر کہہ بھی دیا تھا تو تمھیں سوچنا چاہیے تھا کہ بھلا چاولوں کی تھالی میں بھی فوجیں لڑ سکتی ہیں!"

حاتم نے پاگل سے کہا "بھائی میں پھر کہوں گا کہ تم مجھے پاگل نظر نہیں آتے۔"

پاگل نے کہا "یہاں کوئی بھی تمھیں پاگل دِکھائی نہیں دے گا۔ مگر ہیں سبھی پاگل۔" اور وہ پھر قہقہہ مار کر ہنس دیا اور پلیٹ فرش پر رکھ کر لُڈّی ڈانس کرتے ہوئے اُونچی آواز میں گانا گانے لگا:

میں پاگل، میرا ابّا پاگل
پاگل ہے جگ سارا

وہ رات اور اگلا دِن، حاتم نے بڑی مُشکل سے گزارا۔ شام کو اُسے ٹہلانے کے لیے باہر نِکالا گیا تو اُس نے دیکھا کہ ایک کونے میں تنگ سی سیڑھیاں چھت پر جاتی ہیں۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور موسم چُونکہ سردی کا تھا، اس لیے وہاں زیادہ مریض نہیں تھے۔ حاتم کے ساتھ ایک کم زور سا چپڑاسی تھا جو بے خیالی میں آگے چل رہا

تھا۔ حاتم سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اُس نے چپڑاسی کے سر کے پیچھے ایک ہلکی سی ضرب لگائی ، اور جب وہ گرنے لگا تو اس خیال سے کہ اُسے چوٹ نہ لگ جائے ، پیچھے سے سنبھال لیا۔ پھر بڑے آرام سے زمین پر لٹا دیا۔

حاتم تیزی سے سیڑھیوں کے اندھیرے میں گُم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پاگل خانے کی چھت پر کھڑا تھا۔ سڑک پر روشنیاں ہو رہی تھیں اور کاریں، بسیں، سکوٹر اور رکشا آ جا رہے تھے۔ چھت کی دُوسری جانب خالی زمین پڑی تھی۔ صرف ایک جگہ کوئی عمارت بن رہی تھی ، لیکن مزدُور چُھٹّی کر کے جا چُکے تھے۔ حاتم نے جُھک کر دیکھا۔ ایک جگہ آم کا درخت چھت پر جُھکا ہُوا تھا۔ اُس نے اُچک کر درخت کی بڑی شاخ کو پکڑ لیا اور اُس پر سے ہو کر نیچے زمین پر اُتر آیا۔ ایک بار پھر وہ آزاد تھا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ اگر کسی نے اُسے دیکھ لیا تو دوبارہ پکڑا جائے گا اور پھر اُسے کوئی نہیں چھوڑے گا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

سردیوں کی رات آٹھ بجے ہی اندھیری لگ رہی تھی۔ حاتم سڑک سے ہٹ کر چل رہا تھا کہ کہیں پاگل خانے والے اُسے دیکھ نہ لیں۔ وہ نہر کے کنارے پر آ گیا اور یونی ورسٹی کیمپس کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ نہر میں پانی بہت کم تھا۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ سردی خوب پڑ رہی تھی۔ مگر حاتم کا گرم چغہ اُسے سردی سے بچا رہا تھا۔

وہ یونی ورسٹی کیمپس سے کافی آگے نکل گیا۔ یہاں سے اُجاڑ علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ سڑک بھی خراب تھی۔ حاتم نے سوچا کہ وہ کسی دوسرے شہر چلا جائے۔ مگر سوال یہ تھا کہ کس طرف جائے! اُسے تو کوئی بھی راستہ نہیں آتا تھا۔ اگر کسی طرح وہ بڑی سڑک پر پہنچ جاتا تو وہاں سے بس میں سوار ہو کر کسی دوسرے شہر جا سکتا تھا۔

وہ سڑک کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اُسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس کی جیب میں سونے کی صرف ایک اشرفی تھی۔ اس نے سوچا کاش! اُس کے پاس نقشِ سلیمانی ہوتا کہ وہ اس

کی مدد سے کسی جن کو بُلا کر طرح طرح کے مزے دار کھانے منگوا کر کھاتا۔ عرب میں وہ لوگوں کے سوال پُورے کرنے جنّوں بھُوتوں کی نگری کو نکلتا تھا تو نقشِ سُلیمانی اُس کے پاس ہوتا تھا اور کوئی جن یا پری اُس کی مدد کے لیے آ جاتی تھی۔ لیکن اِس ماڈرن زمانے میں آ کر تو وہ تباہ حال اور فاقہ کش حاتم طائیؒ بن گیا تھا۔

اِتنے میں کسی کار کی روشنی اُس پر پڑی۔ اُس نے دیکھا، ایک کار سڑک پر چلی آ رہی ہے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اگرچہ وہ بھُوکا تھا مگر اُس نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ بلکہ ہمیشہ محتاجوں اور فقیروں کو جھولیاں بھر بھر کر خیرات دی تھی۔

کار اچانک حاتم طائیؒ کے پاس آ کر رُک گئی اور اس میں سے ایک کالا بھُجنگ آدمی باہر نِکلا۔ اس کے بال چھوٹے اور گھنگھریالے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ پاکستان کا نہیں بلکہ افریقہ کے کِسی مُلک کا رہنے والا ہے۔

حاتِم طائیؒ نے اُس آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا

تو اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی گٹھے ہوئے جسم کا اور خوب بھاری بھر کم تھا۔ کار کی مدّھم روشنی میں اس کی شکل بڑی بھیانک دِکھائی دے رہی تھی۔ اس کے نتھنے حبشیوں ایسے چوڑے چوڑے تھے۔ حاتم کے پاس آتے ہی اُس نے جیب سے پستول نکال لیا اور کہا:

"مسٹر، چپکے سے کار میں سوار ہو جاؤ!"

حاتم نے کہا "اے بھائی، تم مجھے مُلکِ حبشہ کے لگتے ہو۔ میں عرب کا رہنے والا ہوں۔ یہ تمھارے ہاتھ میں چمکتی ہوئی شے کیا ہے، اور تم مجھے زبردستی کار میں داخل ہونے کو کیوں کہہ رہے ہو؟"

وہ شخص مسکرایا اور ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بولا "میں ایتھوپیا کا رہنے والا ہوں، مگر ایک عرصہ دِلّی میں رہا ہوں، اس لیے اُردو جانتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ اس میں سے ایک گولی نِکل کر تمھارے جسم میں گھس جائے گی اور تم مر جاؤ گے۔"

"ہیں! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں کیوں مر جاؤں گا؟ ابھی تو مجھے کئی غریب لوگوں کے سوال

پورے کرنے ہیں۔ میں حاتم طائی ہوں "

حبشی ہنسا " تو پھر چلو، اس کار میں چپکے سے سوار ہو جاؤ۔ نہیں تو تمھیں اسی جگہ ہلاک کر دوں گا "

مرتا کیا نہ کرتا، حاتم طائی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہاں پہلے ہی ایک حبشی بیٹھا ہوا تھا۔ آگے ایک آدمی سٹیرنگ پر بُت بنا بیٹھا تھا۔ یہ لوگ حاتم کو شہر سے باہر لے گئے۔ کافی دُور جا کر کھیتوں میں درختوں کا جُھنڈ نظر آیا۔ یہاں ایک پُرانی سی کوٹھی تھی۔ کار کوٹھی کے گیراج میں داخل ہو کر رُک گئی۔

حبشی نمبر ایک نے حاتم طائی کی پسلیوں سے پستول لگا رکھا تھا۔ اُس نے حبشی نمبر دو سے کہا "اِس کو، گیراج کے نیچے، تہہ خانے میں لے چلتے ہیں "

حبشی نمبر دو نے سر ہلا کر کہا " ٹھیک ہے۔ تم اسے وہاں چھوڑ آؤ "

حبشی نمبر ایک حاتم کو تہہ خانے میں لے گیا۔ تہہ خانے کا راستہ گیراج میں سے جاتا تھا۔ یہ

ایک خُفیہ سیڑھی تھی جو تہہ خانے میں نکل گئی تھی۔ یہاں لکڑی کے کئی خالی کھوکھے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ چھت نیچی تھی اور درمیان میں بجلی کے تار کے ساتھ ایک میلا کچیلا سا بلب لٹک رہا تھا۔ دیوار کے پاس ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا تخت پڑا تھا۔ حبشی نمبر ایک نے تخت کی طرف اِشارہ کر کے کہا:

"مسٹر حاتِم طائی، تُم وہاں آرام کرو۔"

حاتِم نے حیران ہو کر پُوچھا "آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

حبشی نمبر ایک نے پستول ہاتھ میں گھُما کر کہا "یہ تُمھیں تھوڑی دیر بعد پتا لگ جائے گا۔"

یہ کہہ کر حبشی نے دروازہ باہر سے بند کیا، تالا لگایا اور چلا گیا۔ اب حاتِم اُس بند تہہ خانے میں اکیلا تھا۔ بُھوک سے اُس کی جان نِکلی جا رہی تھی، مگر یہ اس کی شان کے خلاف تھا کہ کِسی سے روٹی مانگے۔

اِتنے میں تالا کھُلنے کی آواز آئی۔ حاتِم چوکنّا ہو کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھُلا۔ ایک چودہ پندرہ سال

کا لڑکا، جس کے کپڑے گندے تھے، ہاتھ میں روٹی کی چنگیر لیے اندر آیا۔ اُس نے چنگیر حاتم کے آگے رکھ دی اور جانے ہی لگا تھا کہ حاتم نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پُوچھا "بیٹا، تُمھارا نام کیا ہے؟"

لڑکا گھبرا گیا۔ اُس نے چاروں طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا "میرا نام کامران ہے۔ تُم مُصیبت میں پھنس گئے ہو"

اِتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ اس کا چہرہ زرد اور جِسم کم زور تھا، جیسے اُسے کھانے کو کم ملتا ہو۔ حاتم سوچنے لگا کہ وہ کِس مُصیبت میں پھنس گیا ہے، یہ لوگ کون ہیں اور اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں!

اُسے بھُوک بہت لگی تھی۔ چنگیر میں روٹی کے ساتھ آم کا اچار تھا۔ اُس نے روٹی کھائی۔ جِسم میں جان آ گئی۔ اُس نے خُدا کا شُکر ادا کیا اور وہاں سے فرار ہونے کی ترکیب سوچنے لگا۔

مگر اس تہہ خانے میں روشن دان تک نہ تھا۔ بس ایک لوہے کا دروازہ تھا جس میں باہر سے

تالا لگا تھا۔ حاتم نے خدا سے دُعا کی کہ اِس مُصیبت میں اس کی مدد کرے۔

کھانا کھانے کے بعد اُسے نیند آنے لگی۔ سردی زیادہ تھی۔ اُس نے اپنا جُبّہ اچھّی طرح جسم کے گرد لپیٹ لیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر اُونگھنے لگا۔ اُسے سوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اچانک دروازہ کھُلا جس سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔

دو حبشی اندر داخل ہو رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ دُوسرے نے حاتم کے قریب آ کر بڑی تیزی سے اُس کی ناک پر کسی دوائی میں تر کیا ہُوا رومال رکھ دیا۔ حاتم زور سے اُچھلا۔ اُس نے حبشی کا ہاتھ پرے ہٹانے کی کوشش کی، مگر دُوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو چُکا تھا۔

جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ ایک بند ویگن میں پڑا ہے۔ ویگن کے شیشے چڑھے ہُوئے تھے۔ اُس نے شیشے میں سے باہر دیکھا تو دُور دُور تک بنجر زمین دکھائی دی۔ کہیں کہیں ریت کے ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ سامنے

حبشی نمبر ایک پستول لیے بیٹھا تھا۔ دُوسرا حبشی ویگن چلا رہا تھا۔

حاتِم نے پستول والے حبشی سے پُوچھا "بھائی! تُم مُجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟ آخر میرا قصُور کیا ہے؟ تُم کیا چاہتے ہو؟"

حبشی ذرا سا مُسکرایا، لیکن خاموش رہا۔ حاتِم نے اُس سے بات کرنے کی بُہت کوشِش کی مگر وہ کُچھ نہ بولا۔ ویگن بنجر سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔ دُھوپ نِکلی ہُوئی تھی اور سردی زیادہ نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد ویگن ریت کے ٹیلوں میں سے گُزرنے لگی۔ آس پاس کوئی درخت نہ تھا۔ اسے دیکھ کر حاتم کو عرب کا ریگستان یاد آ گیا۔ ویگن ان اُجاڑ رستوں پر دیر تک چلتی رہی۔

آخر ریت کے ٹیلے دُور ہوتے گئے۔ پھر ایک کُھلا میدان آ گیا۔ یہاں کھجُور کے درختوں کا ایک جُھنڈ تھا جس کے پاس ہی دو چار کچّے کوٹھے بنے ہُوئے تھے۔ ویگن کھجُوروں کے جُھنڈ میں سے گُزر کر ایک کوٹھے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ حبشی نمبر ایک نے پستول جیب میں ڈالا اور دروازہ کھول کر باہر

نکل گیا۔ دُوسرا حبشی بھی باہر آ گیا۔ ویگن کا ہارن بجایا گیا تو کوٹھے کا دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک لمبا سا، بھاری بھرکم اور بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی سر پر پگڑ رکھے، باہر نکلا۔

حاتم طائی یہ سارا نظارہ ویگن کے شیشے میں سے دیکھ رہا تھا۔ مونچھوں والے آدمی نے گھور کر دونوں حبشیوں کو دیکھا تو حبشی نمبر دو نے ویگن کی طرف اشارہ کیا۔ مونچھوں والا آدمی ویگن کی طرف آیا اور دروازے میں سے جھانک کر حاتم کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ حبشی کی طرف پلٹ کر بولا:

"یہ تو کوئی عرب معلوم ہوتا ہے۔"

حبشی نمبر ایک نے کہا "شاتو خان، تمھیں کام لینا ہے۔ تمھیں اس سے کیا کہ کوئی کہاں کا رہنے والا ہے۔"

شاتو خان بہت بڑا خرکار تھا اور ڈیم بنانے والے ٹھیکیداروں کو مٹّی اور پتھر سپلائی کرتا تھا۔ اس کے ایجنٹ شہروں سے بچّے اور نوجوان اغوا کر کے لاتے تھے۔ وہ اُن سے جانوروں کی طرح کام لیتا تھا اور کھانے کو سوائے سُوکھی روٹی اور پانی کے اور کچھ

نہیں دیتا تھا۔
شاتو خان نے حبشی نمبر دو کو سو سو روپے کے پندرہ نوٹ دیے اور حاتم کو کوٹھڑی میں لے جا کر بند کر دیا!

موئن جو دڑو کی جادوگرنی

حاتم طائی کو پتّھر توڑنے اور مٹّی کھودنے پر لگا دیا گیا۔
اُس کے ایک پیر میں زنجیر بندھی تھی۔ وہ سارا دن بنجر ٹیلوں کے پتّھر توڑتا، مٹّی کھودتا اور پھر انھیں گدھوں پر لادتا۔ صُبح کو اُسے شکر ملا پانی اور ایک باسی روٹی دی جاتی۔ دوپہر کو بھی یہی کُچھ مِلتا اور رات کو پانی ایسی پتلی چائے کے ساتھ ایک باسی روٹی دی جاتی۔
دس پندرہ روز اسی طرح گُزر گئے۔ حاتِم طائی کم زور ہونے لگا۔ وہ پریشان تھا۔ سوچتا، یہ کس مُصیبت میں پھنس گیا ہُوں۔
غنڈہ کاروں کا یہ کیمپ شہر سے کافی دُور ایک

ویران جگہ پر تھا۔ حاتم کے ساتھ وہاں دُوسرے نوجوان اور بچّے بھی تھے۔ خرکار شاتو خان کے ساتھی بچّوں پر بھی ظُلم کرتے تھے۔ کئی ایک بچّوں کے پاؤں توڑ دیے گئے تھے۔ جو بچّہ بالکُل ہی کام کرنے کے لائق نہ رہتا اُس کو گولی مار دی جاتی اور وہیں مٹّی کھود کر گڑھے میں دفن کر دیا جاتا۔ پولیس چھاپا مارتی تو بچّوں کو بے ہوشی کی دوا سنگھا کر ایک خُفیہ تہہ خانے میں چُھپا دیا جاتا۔ پولیس کو کوئی ثبُوت نہ مِلتا اور وہ واپس چلی جاتی۔ اسی طرح ایک مہینا گُزر گیا۔

حاتِم طائی نے فرار ہونے پر بہت غور کیا مگر اس کے ذہن میں کوئی تدبیر نہ آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں سے فرار ہونا ایک ناممکن بات ہے۔ خرکار شاتو خان کے ایجنٹ ہر وقت غُلاموں کے سر پر پستول تانے پہرا دیتے تھے۔ رات کو انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح کوٹھڑیوں میں بند کرکے باہر سے تالے لگا دیے جاتے۔ کام کرتے کرتے حاتِم طائی کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے۔

آخر حاتم طائی کو قُدرت نے فرار کا ایک موقع دے دیا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ شہر سے ایک ٹرک سبزی اور چارہ لے کر آیا۔ آدھا ٹرک سبزی اور چارے سے بھرا ہوا تھا۔ شاتو خان نے ڈرائیور کو کچھ پیسے دیے اور ڈرائیور نے کلینر سے سبزی اور چارے کے دس بورے نیچے اُتارنے کو کہا۔ یہ ٹرک مختلف جگہوں اور خرکار کیمپوں میں ٹھیکے پر سبزی اور چارہ سپلائی کرتا تھا۔ ٹرک میں ابھی سبزی کی کتنی ہی بوریاں اور چارہ لدا ہوا تھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ بنجر ٹیلوں پر سورج کی آخری کرنیں آہستہ آہستہ اپنا دامن سمیٹ رہی تھیں۔ حاتم اس وقت کوٹھڑی کے باہر بھینس کے لیے چارہ کاٹ رہا تھا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُس وقت اس کے پاؤں میں زنجیر نہیں تھی۔

ٹرک میں لدی ہوئی سبزی کی بوریوں کے پیچھے کچھ جگہ خالی تھی۔ ایک دم حاتم کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ لیکن اس ترکیب پہ جلد عمل کرنے کی ضرورت تھی، کیوں کہ ٹرک واپس جانے کے لیے سٹارٹ ہو چکا تھا۔

حاتم نے ایک پل کے اندر اندر فیصلہ کر لیا کہ

وہ یہاں سے فرار ہوگا اور ضرور فرار ہوگا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شاتو خان ذرا پرے اپنے ایک ایجنٹ کے پاس کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ حاتم ٹکوا ہاتھ میں لیے چارہ کاٹ رہا تھا۔ ٹرک سٹارٹ ہو کر کھسکنے لگا۔ کلینر بھی ڈرائیور کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

ٹرک کھسکتا ہُوا حاتم کی طرف آ رہا تھا اور اُسے حاتم کے سامنے سے گزرنا تھا۔ وہ اسی سُنہری موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹرک رینگتے رینگتے حاتم کے سامنے آ گیا تھا اور شاتو خان اور اُس کے مُلازم ٹرک کی اوٹ میں آ گئے تھے۔

حاتم نے چارہ کاٹنے والا ٹکوا ایک طرف پھینکا، آہستہ سے کُود کر چلتے ٹرک میں سوار ہُوا اور سبزی کی بوریوں کے پیچھے چُھپ کر بیٹھ گیا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ اگر شاتو خان یا اس کے کسی ایجنٹ کی نظر چارے پر پڑ گئی تو حاتم کے فرار کا بھید کُھل جائے گا۔ مگر یہ حاتم کی خوش قسمتی تھی کہ شاتو خان اور اُس کے ایجنٹ کی اُدھر نظر نہ گئی۔

ٹرک نے آخرکار کیمپ سے نِکل کر رفتار پکڑی

اور پھر سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔ حاتم بوریوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس خطرناک علاقے سے دُور نِکل کر کسی جگہ نیچے چھلانگ لگا دے۔

ٹرک کچی سڑک پر ہچکولے کھاتا خُدا جانے کس منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ حاتم نے بوریوں کے پیچھے سے سر باہر نِکال کر دیکھا۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس راستے سے وہ یہاں آیا تھا۔ ٹرک عجیب قِسم کے کھنڈروں میں گزر رہا تھا۔

کہیں اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ کہیں کوئی ٹوٹی پھوٹی دیوار کھڑی تھی۔ حاتم نے پیچھے نظر ڈالی تو اُسے دُور گرد اُڑتی دِکھائی دی۔ گرد کا یہ غبار ٹرک کی طرف آ رہا تھا۔ حاتم کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ کہیں خرکار شاتو خان تو اس کے تعاقب میں نہیں آ رہا؟

حاتم کا اندازہ دُرست تھا۔ ٹرک کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد شاتو خان کوٹھڑی کی طرف آیا تو اُس نے دیکھا کہ چارہ آدھا کٹا اور آدھا ویسے ہی پڑا ہے، اور حاتم غائب ہے۔

اُس نے فوراً کوٹھڑی میں سے اپنی جیپ نِکالی،

پستول گلے میں ڈالا اور جدھر ٹرک گیا تھا، اُدھر جیپ کو ڈال دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ حاتم سبزی والے ٹرک میں ہی فرار ہُوا ہے۔

حاتم ٹرک میں بیٹھا جیپ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال اس کے دماغ میں بار بار گُونج رہا تھا کہ اگر اُس نے فوراً ٹرک سے چھلانگ نہ لگائی تو اُسے باقی عمر بیگار کیمپ میں گزارنی پڑے گی۔ اُس نے دائیں بائیں دیکھا۔ ٹرک ایک ٹیلے کے پہلو سے ذرا ٹیڑھا ہو کر گزر رہا تھا۔ چوں کہ یہاں تھوڑی سی چڑھائی تھی، اس لیے ٹرک کی رفتار کم ہو گئی تھی۔

یہی ایک سُنہری موقع تھا۔ حاتم نے ایک دم ڈھلان پر چھلانگ لگا دی۔ وہ ریت اور مٹی پر گیند کی طرح لُڑھکتا ہُوا کافی دُور جا کر اٹک گیا۔ وہ مٹی میں بھر گیا تھا لیکن اُسے چوٹ نہیں آئی تھی۔ ٹرک ٹیلے کی اوٹ میں، نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ اُسی طرح جھاڑیوں میں دم سادھے پڑا رہا۔ اُسے شانو خان کی جیپ کا انتظار تھا، جو اُس کی تلاش میں ٹرک کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی تھی۔

یہ گہرے سبز رنگ کی جیپ تھی، جو گرد اُڑاتی بڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔ تھوڑی دُور جا کر شاتو خان نے پستول کا فائر کیا۔ شاید وہ ٹرک ڈرائیور کو گولی چلا کر روکنا چاہتا تھا۔ خُدا جانے ٹرک رُکا یا نہیں، مگر جیپ کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی حاتم جھاڑیوں میں سے باہر نکلا اور ایک طرف بھاگنا شرُوع کر دیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں، ٹیکریوں اور کھڈوں میں دوڑتا دوڑتا تھک گیا تو ایک ٹیکری پہ چڑھ کر دیکھنے لگا کہ جیپ اور ٹرک کتنی دُور جا چکے ہیں۔

اس ٹیکری سے اُسے وہ ٹیلا دِکھائی دے رہا تھا جس کے آگے ایک جگہ، سڑک کے نیچ میں، ٹرک اور جیپ کھڑی تھی اور شاتو خان جیپ سے اُتر کر ٹرک کی تلاشی لے رہا تھا۔ پھر اچانک شاتو خان نے ہوا میں تین فائر کیے۔ خاموش اور ویران فضا میں پستول کے تین دھماکے گُونج اُٹھے۔

گولی چلنے کی آواز ٹیلوں میں تھوڑی دیر گُونج کر دُور پہاڑوں میں کہیں گُم ہو گئی۔ شاتو خان جیپ میں بیٹھ کر حاتم کی تلاش میں اُنھی کھنڈروں کی

طرف آ رہا تھا جہاں حاتم طائی بیٹھا تھا۔ یہ جگہ محفوظ نہیں تھی۔ حاتم ٹیلے سے اُتر آیا۔ ٹیکریوں کے بیچ میں تنگ سا راستہ آگے جاتا تھا۔ حاتم کو جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ شاتو خان اس کے تعاقب میں ٹیکریوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ پھر پستول کے فائر کا دھماکا ہوا۔ حاتم طائی گھبرا گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ لوگ اب اُسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ وہ ایک ٹیلے کی جانب گھوما تو جھاڑیوں میں ایک راستہ ٹیلے کے اندر جاتا نظر آیا۔

اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا، جھٹ ٹیلے کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ تنگ اور گول سوراخ تھا اور حاتم اس میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کمر جھکائے اُس تنگ سُرنگ میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ آگے جا کر سُرنگ بند ہو گئی اور سامنے دیوار آ گئی۔ اب حاتم کو احساس ہوا کہ وہ سُرنگ میں قید ہو گیا ہے۔ اگر شاتو خان اِدھر آ گیا تو وہ کہیں نہیں بھاگ سکے گا۔

حاتم کو سُرنگ کے باہر جیپ کے رُکنے اور پھر پستول کے فائر کی آواز سنائی دی۔ شاتو خان

آ پہنچا تھا۔ حاتم نے نااُمیدی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اِتنے میں سُرنگ کے مُنھ کی طرف سے شاتو خان کی غضب ناک آواز آئی:

"حاتم! سیدھی طرح باہر آ جاؤ۔ نہیں تو میں گولی چلانے لگا ہُوں۔ میں نے تمھیں اندر جاتے دیکھ لیا ہے، اور مجھے معلوم ہے کہ اندر سے سُرنگ بند ہے۔ زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہاتھ اُٹھا کر باہر آ جاؤ۔"

حاتم جانتا تھا کہ وہ باہر گیا تو بھی زندہ نہ بچ سکے گا۔ شاتو خان کے پستول سے نِکلی ہُوئی ایک ہی گولی اُس کے جِسم کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دے گی۔ ایسی سخت آزمائش میں وہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ اُس نے خُدا کو یاد کیا اور اُس سے مدد مانگی۔ ابھی دُعا اُس کے ہونٹوں پر ہی تھی کہ ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سُرنگ کی دیوار اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔

حاتم طائی نے دیکھا، دیوار کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی نِکل رہی تھی۔ اُس نے جان بچانے کے لیے دیوار کے اندر چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ

ہی شاتو خان کے پستول کے فائر کی آواز آئی اور پھر گولی سُرنگ کی دیوار سے ٹکرائی۔ مگر حاتِم دیوار کی دُوسری جانب جا چُکا تھا اور دیوار ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ دوبارہ بند ہو گئی تھی۔ اِس قِسم کے جادُو حاتِم نے اپنے زمانے میں بہُت دیکھے تھے، اسی لیے وہ ذرا نہ گھبرایا۔

جب حاتِم نے اپنے آپ کو شاتو خان سے محفُوظ پایا تو پھر اُس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی چھت زیادہ اُونچی نہ تھی۔ دیواروں پر عجیب قِسم کے دیوتاؤں کی تصویریں کھُدی ہُوئی تھیں۔ روشنی چھت میں سے اندر آ رہی تھی۔ یہ نیلے رنگ کی پُراسرار روشنی تھی۔

پھر اچانک فضا میں ایک خُوشبُو پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی عورت کی دھیمی دھیمی آواز سُنائی دی:

"حاتِم، میں صرف اس لیے تمھاری مدد کو آئی ہُوں کہ تُم ایک سخی اِنسان ہو۔ تمھارے گھر سے کوئی بھُوکا کھانا کھائے بغیر واپس نہیں گیا۔"

حاتِم نے پُوچھا "تُم کون ہو؟"

آواز نے کہا "حاتِم، میری بات غور سے سُنو!

تُم اس وقت پاکستان کے ایک پُرانے اور تاریخی کھنڈر موئن جودڑو میں ہو اور جس سُرنگ میں کھڑے ہو یہ آج سے آٹھ ہزار سال پہلے اس علاقے کی سب سے بڑی جادُوگرنی قُلابہ کا مندر تھا، اور میں ہی وہ قُلابہ ہُوں۔"

حاتِم طائی نے کہا "اے قُلابہ، سب سے پہلے میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہُوں کہ تُم نے میری جان بچائی۔ تمھیں تو معلُوم ہی ہوگا کہ ایک حیرت انگیز حادثے کی وجہ سے میں ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے زمانے سے نکل کر اس زمانے میں آ گیا ہوں۔"

قُلابہ نے کہا "ہاں، میں جانتی ہُوں۔ مجھ سے گزرے ہُوئے زمانے اور آنے والے زمانے کی کوئی بات چھپی ہُوئی نہیں ہے۔"

حاتِم نے کہا "اب میرے سامنے ایک لمبا سفر ہے۔ خُدا جانے مجھے کب واپس اپنے زمانے میں جانا نصیب ہوگا۔ میں اپنے زمانے سے کوئی ڈیڑھ ہزار سال آگے آ گیا ہُوں، اس لیے تُم میری کیا مدد کر سکتی ہو؟ کیوں کہ مُجھے اپنے اس طویل سفر میں ان گنت مُشکلیں پیش آئیں گی اور جان کا بھی خطرہ

ہوگا۔"

قلابہ کہنے لگی "حاتم، تم نے ہمیشہ دکھی اور ضرورت مند انسانوں کی مدد کی ہے۔ تم خود رات کو بھوکے سوئے ہو، لیکن بھوکوں کو کھانا ضرور کھلایا ہے، اس لیے میں تمھاری ضرور مدد کروں گی۔"

حاتم طائی نے پوچھا "تم میری کس طرح مدد کر سکتی ہو؟"

قلابہ کی آواز سنائی دی "میں تمھیں ایک سرمہ دوں گی۔ یہ سرمہ میں نے آج سے آٹھ ہزار سال پہلے تیار کیا تھا۔ جب تم وہ سرمہ اپنی آنکھوں میں لگا لوگے تو تمھارے اندر دو زبردست تبدیلیاں پیدا ہوں گی۔ پہلی تبدیلی یہ ہوگی کہ تم پر نہ تو زہر کا اثر ہوگا اور نہ کوئی تیر تلوار یا کوئی اور چیز اثر کر سکے گی۔"

حاتم نے پوچھا "اور دوسری تبدیلی کیا ہوگی؟"

قلابہ نے کہا "دوسری تبدیلی یہ ہوگی کہ تمھاری زبان میں اتنا اثر آ جائے گا کہ تم اپنی آنکھیں بند کر کے تین بار ایک خاص اسم پڑھ کر جو کہو گے، وہی ہو جائے گا۔"

حاتم طائی نے خوش ہو کر کہا "تمہارا بہت بہت شکریہ۔ یہ تو تم نے مجھے دو بڑے قیمتی طلسم دے دیئے۔ لیکن وہ اسم کیا ہے؟"

قُلابہ نے اُسے اسم سکھایا اور پھر بولی "جو انسان دُکھی لوگوں کی مدد کرتا ہے، اُس کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اب تم آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولو گے تو تمھیں اپنے پاس ہی پتھّر پر طلسمی سُرمہ اور سلائی مل جائے گی۔ آنکھیں بند کر دو۔"

حاتم نے آنکھیں بند کر لیں، اور تھوڑی دیر بعد قُلابہ کا اِشارہ پا کر کھولیں تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے پتھّر پر ایک پُرانی طرز کی پتھّر کی شیشی اور سنگِ مرمر کی ایک سلائی پڑی ہے۔ قُلابہ نے کہا:

"سُرمے کی ایک ایک سلائی اپنی آنکھوں میں لگا لو۔"

حاتم نے قُلابہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سُرمے کی ایک ایک سلائی دونوں آنکھوں میں لگا لی، لیکن اُس نے اپنے اندر کسی قِسم کی کوئی

تبدیلی محسوس نہ کی۔ صرف آنکھوں میں کچھ ٹھنڈک سی آ گئی۔ قلابہ نے کہا :

"حاتم طائی، تمھارے اندر اب دونوں طاقتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اب تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور تم آنکھیں بند کر کے تین بار اسم پڑھ کر جو کہو گے، وہی ہو جائے گا۔"

حاتم نے کہا "میں یہ دونوں طاقتیں آزمانا چاہتا ہوں۔"

قلابہ بولی "بہت اچھا۔ ایسا کرو کہ آنکھیں بند کر کے تین بار اسم پڑھو اور پھر اس نیلی شیشی سے کہو کہ غائب ہو جائے، کیوں کہ تمھیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

حاتم طائی نے ایسا ہی کیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے تین بار قلابہ کا سکھایا ہوا اسم پڑھا اور آنکھیں کھول کر کہا :

"اے نیلی شیشی، غائب ہو جا!"

پلک جھپکتے میں نیلی شیشی سلائی سمیت غائب ہو گئی! حاتم طائی حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ قلابہ کی آواز آئی :

"اب تُم اپنی دُوسری طاقت آزمانا چاہتے ہو؟"
"ہاں" حاتِم نے جواب دیا۔
قُلابہ نے کہا "تو پھر ایسا کرو کہ اپنا ہاتھ اِس پتّھر پر رکھو اور پھر دُوسرا پتّھر اُٹھا کر پُوری طاقت سے اپنے ہاتھ پر مارو۔"
حاتِم نے کہا "اس طرح تو میرے ہاتھ کا کچُومر نِکل جائے گا۔"
قُلابہ ہنسی اور پھر بولی "یہی تو تمھیں آزمانا ہے۔"
حاتِم نے ایک بڑا سا پتّھر اُٹھایا۔ پھر اپنا بایاں ہاتھ پتّھر پر رکھ دیا اور آہستہ سے ہاتھ پر پتّھر مارا۔ اُسے درد کا ذرا سا بھی احساس نہ ہُوا۔
قُلابہ نے کہا "پُوری طاقت سے مارو!"
حاتِم نے پتّھر سر سے اُوپر اُٹھایا، ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر زور سے پتّھر ہاتھ پر دے مارا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پتّھر کے ٹکڑے ہو گئے مگر اُس کے ہاتھ پر ذرا سی بھی چوٹ نہ لگی۔ قُلابہ نے کہا:
"تُم نے اب خُود آزما کر دیکھ لیا ہے کہ تمھیں

کچھ نہیں ہُوا۔ پتھّر ٹُوٹ گیا لیکن تمھیں چوٹ نہیں آئی۔ دُنیا کی کوئی تلوار، تیر، نیزہ یا پستول، بندوق تُم پر اثر نہیں کر سکے گی۔ اب میں جاتی ہُوں۔"

حاتِم کچھ اور پُوچھنے ہی والا تھا کہ غار کی نیلی روشنی غائب ہو گئی، اور اس کے ساتھ ہی دیوار آہستہ آہستہ بند ہونا شرُوع ہو گئی۔ وہ جلدی سے سُرنگ میں آ گیا۔ دیوار دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئی تھی۔ حاتِم اب اپنے اندر ایک نئی طاقت محسُوس کر رہا تھا۔ اب اُسے شاتو خان کے پستول کی گولی سے کسی قِسم کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ سُرنگ سے باہر آ گیا۔ کچّی زمین پر شاتو خان کی جیپ کے پہیّوں کے نشان تھے۔ شاتو خان جا چُکا تھا۔

حاتِم راستوں سے بے خبر تھا۔ اُسے کچھ معلُوم نہ تھا کہ کون سا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ اب اُس کے اندر ایک نئی طاقت آ چُکی تھی تو اُسے کامران کا خیال آیا جو خرکار کیمپ میں مُصیبت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ جس طرح سے بھی ہو سکے اس مُصیبت زدہ لڑکے کو خرکاروں کے جہنّم سے نِکال کر اُس کے گھر پُہنچانا چاہیے۔ حاتِم کو یہ اِحساس

بھی تھا کہ اگرچہ شاتو خان اور اُس کے آدمی اُسے تو کوئی نُقصان نہیں پُہنچا سکیں گے مگر کامران کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اُسے بچاتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت تھی کہ وہ ان لوگوں کی زد میں نہ آ جائے۔ اُس نے کامران کو خرکاروں کے چُنگل سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جیپ کے نشانوں پر خرکار کیمپ کی طرف روانہ ہُوا۔ اُسے شام راستے میں ہی ہو گئی۔ ٹیلوں کے سائے شام کے پھیلتے اندھیروں میں گھُل مِل گئے۔ آسمان پر ستارے چمکنے لگے۔ وہ خرکار کیمپ کے قریب پُہنچا تو رات ہو چُکی تھی۔ دُور سے چارے والی کوٹھڑی کے باہر ہریکین لیمپ کی روشنی نظر آئی۔ اسی کوٹھڑی میں کبھی وہ جانوروں کی طرح زنجیروں سے بندھا ہُوا رات کو سویا کرتا تھا اور اب بے چارہ کامران وہاں پڑا ہے۔

حاتم ہر مُمکن احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شاتو خان کے کسی آدمی کو اس کے آنے کی خبر لگے۔ وہ ٹیلوں کے پیچھے سے ہو کر کوٹھڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں زمین بنجر تھی۔

ریت اور کنکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اچانک حاتم کا پاؤں کسی ربڑ کی طرح کی نرم شئے پر پڑ گیا۔ پھنکار کی آواز سُنائی دی اور ایک سانپ حاتم کے پاؤں کے نیچے سے نکل کر اُس کے سامنے جھومنے لگا۔ سانپ کے پھن پر سفید لکیریں تھیں، اُس کی سُرخ آنکھیں آگ برسا رہی تھیں اور دو شاخہ زہریلی زبان بار بار باہر نکل رہی تھی۔ حاتم کو یقین تھا کہ طلسمی سُرمہ لگانے کی وجہ سے سانپ کا زہر اُس پر اثر نہیں کرے گا۔ پھر بھی وہ سانپ کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔

مگر سانپ نے اُسے زیادہ خوف زدہ ہونے کی مُہلت نہ دی۔ وہ پھن لہرا کر آگے کو جُھکا اور تیزی سے اس کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ یہ بڑا زہریلا ناگ تھا اور اس کا ڈسا ہُوا پانی بھی نہیں مانگتا۔ ایک دم گلا بند ہو جاتا ہے، ناک مُنھ سے خُون جاری ہو جاتا ہے اور انسان زمین پر گرتے ہی مر جاتا ہے۔ لیکن حاتم پر اس کے زہر کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ وہ بڑا خُوش ہُوا اور اُس کے دِل میں قُلابہ کی قدر اور بڑھ گئی۔ اُس نے سچ کہا تھا۔ اب اُس پر کسی بھی

ہلاک کرنے والی شے کا اثر نہیں ہوگا۔

سانپ ابھی تک پھن اُٹھائے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید حیران تھا کہ جس اِنسان کے جسم میں ابھی اُس نے اپنا زہر داخل کیا ہے، وہ زمین پر گر کر مرا کیوں نہیں؟

حاتم کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اُس نے دِل ہی دِل میں قُلابہ کا سکھایا ہُوا اِسم پڑھا اور پھر سانپ کی طرف دیکھ کر کہا:

"پتّھر ہو جا!"

اُس کی زبان سے یہ لفظ نکلے ہی تھے کہ سانپ، جو ابھی ابھی جھُوم رہا تھا اور جس کی دو شاخہ زبان بار بار اس کے مُنھ میں سے نِکل رہی تھی، ایک دم ساکت ہو گیا۔ حاتم نے ہاتھ بڑھا کر اُس کو گردن سے پکڑا تو وہ اس طرح اُس کے ہاتھ میں آ گیا جیسے کوئی پتّھر کی لاٹھی ہو۔ سانپ کا بدن ٹھنڈا اور سخت تھا۔ وہ پتّھر بن چُکا تھا!

حاتم طائی کا دِل خوُشی سے باغ باغ ہو گیا۔ قُلابہ کے طِلسم کی دونوں باتیں سچ نکلی تھیں۔ حاتم نے سانپ کو ہاتھ میں لے کر زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ زمین پر

گِر کر سانپ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

سانپ سے نمٹنے کے بعد حاتم آگے بڑھا۔ اندھیرے میں خرکاروں کی کوٹھڑی کے باہر جلتا ہُوا لیمپ اب اس کے سامنے تھا۔ وہ دائیں جانب ایک خُشک نالے کے ساتھ ساتھ چلتا ہُوا کوٹھڑی کے پیچھے آ گیا۔ اب بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اُس نے دبے پاؤں چلنا شروع کیا اور پھر کوٹھڑی کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سُننا چاہتا تھا کہ اندر سے کوئی آواز تو نہیں آ رہی۔ مگر کوٹھڑی میں سنّاٹا چھایا ہُوا تھا۔ ابھی رات شروع ہی ہوئی تھی۔

حاتم جانتا تھا کہ خرکار بچّوں کو شروع رات میں ہی کوٹھڑیوں میں بند کر دیتے ہیں اور پھر مُنھ اندھیرے اُنھیں اُٹھا کر اُن سے مٹّی کھُدواتے اور پتّھر تڑواتے ہیں۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا اور پھر کھسکتا کھسکتا کوٹھڑی کی اُس دیوار کے پاس آ گیا جہاں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ حاتم نے تھوڑا سا سر آگے کر کے کھڑکی میں سے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ کوٹھڑی میں مٹّی کا دیا جل رہا تھا جس کی روشنی بڑی دھیمی

تھی۔ اس روشنی میں حاتم نے شاتو خان کو بستر پر بے سُدھ سوتے دیکھا۔ اس کے خرّاٹوں کی ہلکی ہلکی آواز کوٹھڑی میں گونج رہی تھی۔ حاتم نے سوچا کہ کامران کہاں ہوگا۔ اچانک اُسے خرکاروں کے تہہ خانے کا خیال آیا۔ کیا کامران تہہ خانے میں بند ہے؟

سنسنی خیز کہانی

کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز آئی۔

حاتم دیوار سے ہٹ کر مٹّی کے ایک تودے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اُسے خطرہ تھا کہ کُتّے کے بھونکنے کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی پہرے دار ضرور اُٹھے گا، اور ایسا ہی ہُوا۔ کُتّا برابر بھونک رہا تھا۔ اُس نے حاتم کی بُو پا لی تھی اور اب اپنے مالکوں کو خبردار کر رہا تھا کہ آدھی رات کو کوئی آیا ہے۔

خرکار کیمپ کا ایک پہرے دار، ہاتھ میں بندوق پکڑے، ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہُوئے شاتو خان کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ حاتم دم سادھے مٹّی کے تودے کے پیچھے چھُپا بیٹھا پہرے دار

کو آگے آتا دیکھ رہا تھا۔ کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے پہرے دار نے جھانک کر اندر دیکھا۔ شاتو خان بے سُدھ پڑا سو رہا تھا۔ اندر سب خیریّت تھی، لیکن کُتّا ابھی تک بھونک رہا تھا۔

پہرے دار نے کُتّے کو کھول دیا۔ کُتّا چھلانگ لگا کر اس طرف دوڑا جہاں حاتم چُھپا ہُوا تھا اور جدھر سے کُتّے کو اُس کی بُو آ رہی تھی۔ حاتم نے ستاروں کی دھیمی روشنی میں کُتّے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پریشان ہُوا کہ یہ نئی مُصیبت کدھر سے آ گئی!

کُتّا حاتم کے سامنے تودے کے پیچھے آ کر بھونکنے لگا۔ اُس نے حاتم کو دیکھ لیا تھا۔ پہرے دار بندوق ہاتھ میں لیے تودے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی چور وہاں چُھپا ہُوا ہے یا پھر کوئی غُلام فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ حاتم نے کُتّے کی طرف گہری نظر سے دیکھا اور دِل میں قُلابہ کا بتایا ہُوا اسم تین بار پڑھا۔ پھر بھونکتے ہوئے کُتّے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا :

"غائب ہو جا!"

اِتنا کہنا تھا کہ کُتّا بھونکتے بھونکتے ایک دم غائب

ہو گیا۔ فضا پر خاموشی چھا گئی۔ پہرے دار اب مٹّی کے تودے کے پاس پہنچ کر اپنے کُتّے کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ کتّا اچانک کہاں گُم ہو گیا!

حاتِم تودے کے پیچھے ذرا سا کھسکا تو ایک پتّھر لُڑھک گیا۔ جس سے آواز پیدا ہوئی۔ پہرے دار نے اُس طرف بندُوق کا رُخ کر کے زور سے کہا "باہر آ جاؤ، نہیں تو گولی چلا دُوں گا!"

حاتِم تودے کے پیچھے سے باہر نِکلا تو پہرے دار نے اُسے پہچان لیا۔ اُس نے کہا:

"تُم بھاگ رہے تھے؟ موتی کہاں ہے؟"

حاتِم اس عرصے میں تین بار اِسم پڑھ چُکا تھا۔ اُس نے پہرے دار کی طرف دیکھ کر کہا:

"جہاں کُتّا گیا ہے، تُم بھی چلے جاؤ!"

حاتِم کی زبان سے یہ جُملہ نِکلا ہی تھا کہ پہرے دار بندُوق سمیت غائب ہو گیا۔ اب میدان خالی تھا۔ حاتِم تہہ خانے کی طرف چلا۔ اس کا راستہ ایک کوٹھڑی کے اندر سے جاتا تھا اور حاتِم اس راستے سے خُوب واقف تھا۔ کُتّے اور پہرے دار کے غائب ہو جانے سے گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ حاتِم اندھیرے میں

پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا کوٹھڑی کے سامنے آ کر رُک گیا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ حاتم نے دروازے کے قریب جا کر اُسے دھکّا دیا تو وہ کھُل گیا۔ وہ کوٹھڑی میں چلا گیا۔ سامنے والے کونے میں سیڑھیاں تھیں جو نیچے تہہ خانے کو جاتی تھیں۔ حاتم جلدی سے سیڑھیاں اُتر گیا۔

تہہ خانے میں کامران مٹّی کے فرش پر سو رہا تھا۔ حاتم نے اُسے جگایا۔ وہ فاقوں سے کمزور ہو رہا تھا۔ اُس کے پاؤں میں لوہے کی زنجیر بندھی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا تو حاتم نے اُسے تسلّی دی اور آہستہ سے کہا:

"کامران، میں تمھیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔"

کامران نے کہا "سردار نے اِرد گرد سخت پہرا لگا رکھا ہے۔ غم خواروں کی ایک ٹولی بندوقیں لے کر تمھاری تلاش میں گئی ہے۔"

حاتم نے کہا "تم اُن کی فکر نہ کرو اور میرے ساتھ چلو۔"

"مگر میرے پاؤں میں تو زنجیر ہے۔"

حاتم نے پوری طاقت سے زنجیر پر ہاتھ مارا، جس

طرح جوڈو کراٹے والے ہاتھ مارا کرتے ہیں۔ زنجیر ٹوٹ گئی۔

کامران نے حیران ہو کر پوچھا "اتنی طاقت تم میں کہاں سے آ گئی؟"

حاتم نے کہا "یہ تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ جلدی سے یہاں سے بھاگ چلو۔"

حاتم کامران کو لے کر تہہ خانے والی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ چاند اوپر آ گیا تھا جس کی پھیکی سی روشنی پھیل گئی تھی۔ وہاں سے بھاگنے کے لیے اتنی روشنی ہی کافی تھی۔ وہ کوٹھڑی کے پیچھے سے ہو کر کچے راستے پر نکلے ہی تھے کہ ہوائی فائر ہوا، اور اس سے پہلے کہ حاتم اور کامران بھاگ کر کہیں چھپتے، ظالم شاتو خان پستول لیے سامنے کھڑا انھیں سرخ سرخ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

"شکار خود جال میں پھنس گیا۔ تم اپنے ساتھ کامران کو بھی بھگا کر لے جا رہے تھے۔ بہت خوب! اب تم دونوں کی لاشیں یہاں تڑپ رہی ہوں گی۔"

حاتم نے مسکرا کر کہا "شاتو خان، تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اپنے ناپاک ارادوں سے باز آ جاؤ اور

ہمیں جانے دو، ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔"

گولی کی آواز سُن کر دُوسرے پہرے دار بھی بندوقیں لے کر آ گئے تھے۔ حاتم پریشان ہو گیا۔ اُسے سب سے زیادہ کامران کی فکر تھی، کیوں کہ کامران اُن کی گولیوں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ حاتم نے کامران کو اپنے پیچھے کر لیا۔

شاتو خان نے گرج دار آواز میں اپنے آدمیوں کو حُکم دیا کہ ان دونوں کو الگ الگ زنجیروں سے باندھ دیا جائے۔ اب حاتم کے لیے صِرف یہی چارہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے طِلسم سے کام لے۔ اُس نے دِل میں قُلابہ کا بتایا ہُوا اِسم پڑھا اور شاتو خان کی طرف غور سے دیکھ کر کہا :

"شاتو خان، پتّھر بن جا!"

اور دیکھتے ہی دیکھتے شاتو خان پتّھر کا بُت بن گیا۔ اُس کا ایک قدم آگے تھا اور ایک ہاتھ اُوپر اُٹھا ہُوا تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے یہ حال دیکھا تو آگے بڑھ کر اُسے ہلایا۔ شاتو خان پتّھر کے مجسّمے کی طرح زمین پر گر پڑا، اور گرتے ہی اُس کے چار ٹُکڑے ہو گئے۔ حاتم سمجھ گیا کہ اب یہ شخص کبھی زندہ نہیں ہو سکے گا۔

اُس نے چلّا کر کہا :

"اگر تُم میں سے کسی نے ہمیں پکڑنے کی کوشش کی تو میں اُسے بھی شاتو خان کی طرح پتّھر کا بنا دُوں گا۔"

سب لوگ ڈر کر اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ لیکن اُن میں سے ایک نے، جو شاتو خان کا خاص آدمی تھا، حاتِم پر گولی چلا دی۔ گولی حاتِم کے ماتھے پر آنکھ سے ذرا اُوپر لگی اور پھر اُچھل کر واپس ایک خرکار کے سینے پر جا لگی۔ خرکار چیخ مار کر گِرا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ کامران خوف سے کانپ رہا تھا۔ حاتِم نے اُسے اپنے پیچھے چُھپا لیا اور بلند آواز سے کہا :

"اگر تُم نے اپنے ہتھیار میرے قدموں میں نہ پھینکے تو میں تُم سب کو پتّھر بنا دُوں گا۔ میں دس تک گنتی گِنوں گا۔ ایک، دو، تین......"

ابھی اُس نے پانچ تک گنتی گِنی تھی کہ سارے خرکاروں نے اپنے ہتھیار اُس کے آگے پھینک دیے۔

حاتِم نے کامران سے کہا "دو بندُوقیں اُٹھا لو۔"

کامران نے دو بندوقیں اُٹھا لیں۔ باقی ہتھیار حاتم نے اُٹھائے اور خرکاروں سے کہا "کیمپ کی طرف مُنھ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

سارے خرکار اپنے کیمپ کی طرف مُنھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ حاتم نے ان کو بھی پتّھر بنا دیا۔ اب میدان صاف تھا۔ کامران نے تعجّب سے پُوچھا:

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں! تم نے یہ جادو کہاں سے سیکھا ہے؟"

حاتم نے کہا "جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔ ہمیں ابھی کیمپ کے سارے بچّوں کو آزاد کرانا ہے۔"

اُس نے دُوسرے تہہ خانوں اور کوٹھڑیوں میں جا کر سارے بچّوں کو آزاد کرایا اور اُن کی زنجیریں توڑ دیں۔ یہ سب دس بچّے تھے۔

اُس نے اُنھیں شانو خان کی جیپ میں بٹھایا اور روانہ ہو گیا۔

صُبح کے وقت اُن کی جیپ کراچی جانے والی بڑی سڑک پر آ گئی۔ کامران کے سِوا سارے بچّے کراچی کے رہنے والے تھے۔ کامران ساہیوال کا رہنے والا تھا۔ حیدر آباد شہر پُہنچ کر حاتم طائی نے کراچی کے بچّوں کو

پولیس انسپکٹر کے حوالے کیا ، اپنا بیان لکھوایا اور بچّوں سے بھی بیان دلوایا۔ پولیس کی ایک پارٹی بچّوں کو لے کر کراچی کی طرف روانہ ہو گئی اور حاتم کامران کو ساتھ لے کر ساہیوال کی طرف چل پڑا۔

دُوسرے روز صُبح صُبح وہ ساہیوال پُہنچ گئے۔ حاتم کامران کو لے کر اس کے ماں باپ کے پاس گیا۔ اُنھوں نے اپنے لختِ جگر کو دیکھا تو خُوشی سے آنکھوں میں آنسُو آ گئے۔ کامران نے کہا :

" ابّا جان ، اگر حاتم مجُھے نہ چھُڑاتا تو میں زندگی بھر آپ کے پاس نہ آ سکتا تھا "

حاتم نے ایک رات وہاں قیام کیا اور دُوسرے روز لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق کچّی سڑک پر چل رہا تھا ، اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کسی دُکھی اِنسان کو راستے میں اُس کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ اب وہ اپنے بدن میں ایک نئی طاقت محسُوس کر رہا تھا۔ طاقت کا یہ اِحساس اُس کو قُلابہ کا سُرمہ آنکھوں میں لگانے کے بعد ہُوا تھا۔

چلتے چلتے وہ دریا کے کنارے پُہنچ گیا۔ اُس کا خیال

تھا کہ وہ کسی جگہ سے دریا پار کر کے دیہات کی سیر کرتا ہُوا واپس لاہور پہنچے گا۔ وہ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ کشتی کی تلاش میں جا رہا تھا کہ اُس کی نظر ایک بُوڑھے پر پڑی جو دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھا رو رہا تھا۔ حاتم کی رگِ ہمدردی پھڑک اُٹھی۔ وہ اُس بُزرگ کے پاس جا کر بولا :

"محترم، آپ کو کیا دُکھ ہے کہ آپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رونے لگتے ہیں؟"

اُس بُزرگ نے کہا "اے نوجوان، اپنی راہ لے۔ میری مُصیبت ایسی پُر اسرار ہے کہ تیری جگہ کوئی جن بھُوت بھی آ جائے تو میری کوئی مدد نہ کر سکے گا۔"

حاتم نے کہا "محترم، میرا نام حاتم طائی ہے۔ میں ہمیشہ سے انسانوں کے کام آتا رہا ہُوں اور اُن کے دُکھ درد دُور کرنے کی کوشش کرتا رہا ہُوں۔ آپ اپنی مُصیبت بیان کریں۔ میں آپ کی مُشکل حل کرنے کی پُوری پُوری کوشش کروں گا۔"

مردِ بُزرگ نے حاتم طائی کا نام سُنا تو اُسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ حاتم کی حالت کُچھ اِتنی اچھّی نہیں تھی۔ وہ خرکاروں کے کیمپ میں ایک مہینا گُزار کر

آیا تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے پر ایسی چمک ضرور تھی، جو انسانوں سے ہمدردی کرنے اور اُن کی مدد کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جانے کیوں اُس بزرگ کو یقین ہو گیا کہ حاتم طائیؒ اُس کی مشکل حل کر سکے گا۔ اُس نے کہا:

"اے حاتم طائیؒ، میری کہانی جتنی عجیب و غریب ہے، اُتنی ہی پُر اسرار بھی ہے۔ تو جب سُنے گا تو تجھے یقین نہیں آئے گا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

حاتم نے کہا "میرے محترم، آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی ایسی عجیب و غریب، پُراسرار اور سنسنی خیز کہانیاں سُنی ہیں کہ اب کوئی کہانی میرے لیے پُر اسرار نہیں رہی۔ اس لیے آپ اپنی کہانی بیان کریں۔"

مردِ بزرگ نے اپنی کہانی یوں سُنانی شروع کی:

"اے حاتم، آج سے پانچ برس پہلے کا واقعہ ہے کہ میں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ شہر لاہور سے کاروبار کے سلسلے میں بحرین کی طرف روانہ ہُوا۔ میرے بیٹے نوجوان تھے اور میرے ساتھ کاروبار کے خیال سے سفر کر رہے تھے۔ کراچی بندرگاہ سے ہم ایک سمندری جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ جہاز ایک جاپانی جہاز ران کمپنی کا تھا، اور زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پھر بھی اس میں کافی

مُسافر سوار تھے۔

"کراچی سے جہاز رات کے وقت روانہ ہُوا اور ساری رات سفر کرنے کے بعد دُوسرے دِن صُبح کُھلے سمندر میں پُہنچ گیا۔ سمندر پُرسکُون تھا اور کسی طُوفان کا خطرہ نہ تھا۔ سارا دِن جہاز سمندر میں چلتا رہا۔ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ جہاز کے کیبن میں لیٹا کتاب پڑھتا رہا۔ رات کا کھانا کھا کر ہم نے کچُھ دیر باتیں کیں، اور پھر سو گئے۔

"آدھی رات کے وقت جہاز کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ہماری آنکھ کُھل گئ۔ کیبن کی بتّی جل رہی تھی۔ میرے بیٹوں نے مجُھ سے پُوچھا کہ یہ جھٹکا کس چیز کا تھا۔ میری سمجھ میں کچُھ نہیں آ رہا تھا۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ جہاز نے ایک بار پھر جھٹکا کھایا۔ یہ جھٹکا پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھماکے کی آواز سُنائی دی، اور پھر ایسا معلُوم ہُوا جیسے جہاز کئ گز اُوپر اُچھل کر نیچے گرا ہو۔ ہم اپنی نِشستوں سے گر پڑے۔ سامان بھی فرش پر بکھر گیا۔ تمام مُسافر شور مچانے لگے۔ میں کیبن سے باہر آیا تو کاریڈار میں لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اس کے بعد

جہاز میں اُوپر تلے دو دھماکے ہُوئے، جیسے اس کے اندر بم پھٹے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی جہاز میں آگ! آگ! آگ! کا شور مچ گیا۔

"جہاز کے نچلے ڈیک میں سے شُعلے اُٹھ رہے تھے۔ عورتیں بچّے رو رہے تھے۔ مرد پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر پناہ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اُسی وقت سمندر میں کشتیاں اُتار دی گئیں۔ مُسافروں نے ان کشتیوں میں اُوپر سے چھلانگیں لگانی شروع کر دیں، جس کی وجہ سے کئی کشتیاں سمندر میں غرق ہو گئیں۔

"میں بھی اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر ایک کشتی میں سوار ہو گیا۔ یہ کشتی پریشان اور سہمے ہُوئے مسافروں سے بھری ہُوئی تھی اور سمندر کا پانی اُسے تنکے کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ جہاز میں آگ لگی ہُوئی تھی اور اُونچے اُونچے شعلے آسمان کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ دُوسری کشتیاں بھی مُسافروں سے بھری ہُوئی سمندر کی لہروں پر، خُدا کے بھروسے، بہی چلی جا رہی تھیں۔ ہماری کشتی میں جہاز کا ایک افسر بھی تھا۔ اُس نے کشتی کا کنٹرول سنبھال لیا اور کھانے پینے کی چیزوں کا راشن کر دیا۔ اُس کے حساب سے ہماری کشتی بحرین سے اتنی دُور تھی کہ ہم

اسی رفتار سے سمندر میں سفر کرتے تو دس روز بعد ساحل پر پہنچ جاتے۔

"جہاز کے افسر نے خوراک اور پانی کو دس دِنوں میں تقسیم کر دیا اور کہا، اگر کسی نے زیادہ خوراک یا پانی حاصل کرنے کی کوشش کی تو اُسے سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ کشتی سمندر میں اپنے آپ ہی چلی جا رہی تھی۔ دُھوپ اور سمندر کے پانی کی چمک نے مُسافروں کو نڈھال کر دیا تھا۔ لیکن ابھی ایک اور مُصیبت ہمارا اِنتظار کر رہی تھی۔

"تیسرے دِن اچانک سمندر میں طُوفان آ گیا، آسمان پر گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے، تیز ہوا چلنے لگی اور پھر مُوسلا دھار بارش شرُوع ہو گئی۔ افسر نے مُسافروں کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ کشتی میں سے پانی نِکالیں۔ میں بھی اپنے بیٹوں کے ساتھ کشتی میں جمع ہونے والا بارش کا پانی نِکال رہا تھا کہ بارش اور زیادہ تیز ہو گئی۔

"طُوفان کا زور بڑھتا چلا گیا۔ کشتی سمندر میں اُٹھنے والی بڑی بڑی لہروں پر تِنکے کی طرح ڈولنے لگی۔ مُسافر پریشان ہو گئے۔ کئی ایک نے زور زور سے دُعائیں مانگنی شرُوع کر دیں۔ افسر نے بلند آواز سے مُسافروں کو

تسلّی دی۔ ابھی وہ تسلّی دے ہی رہا تھا کہ ایک پہاڑ ایسی لہر اُٹھی اور اُس نے ہماری کشتی کو مُسافروں سمیت سمندر میں اُلٹ دیا۔

"میں اور میرے بیٹے تیرنا جانتے تھے۔ میں تیرتا ہُوا اُوپر آیا تو میرا ہاتھ اُلٹی ہُوئی کشتی کے کُنڈے پر پڑ گیا جسے پکڑ کر میں کشتی کے اُوپر آ گیا۔ مجھے سب سے زیادہ اپنے بیٹوں کی فِکر تھی۔

"میں نے چاروں طرف دیکھا۔ طُوفانی لہریں اُلٹی ہُوئی کشتی کو بہائے لیے جا رہی تھیں۔ چند ایک مُسافروں کو میں نے سمندر کی بپھری ہُوئی موجوں میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا اور پھر وہ بھی ڈُوب گئے۔ اب کوئی مُسافر دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنے بیٹوں کو یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر خُدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

"کیا دیکھتا ہُوں کہ شمال جانب میرے دونوں بیٹے کشتی کے اُوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میرے اندر نئی طاقت آ گئی۔ میں نے انھیں کھینچ کر کشتی پر چڑھا لیا۔ تھکن سے وہ بھی چُور تھے اور خوف زدہ بھی تھے۔ ہم صبر شُکر کر کے کشتی کے ساتھ چمٹے رہے۔ طُوفان ہمیں سمندر کی لہروں پر بہائے لیے چلا جا رہا

تھا۔ ساری رات ہماری اُلٹی ہُوئی کشتی ہم تینوں کو پیے خُدا جانے کس طرف بہتی رہی۔ دِن نِکلا تو ہم نے دیکھا کہ چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔سمندر ہی سمندر ہے۔

"طوفان تھم چُکا تھا۔ بارش بند ہو گئی تھی لیکن آسمان پر بادل ابھی تک چھائے ہُوئے تھے۔ بھُوک اور پیاس سے ہمارا بُرا حال ہو رہا تھا۔میرے بیٹے جوان تھے، بہادُر تھے۔شاید اسی لیے وہ ہر مُصیبت کا مُقابلہ کر رہے تھے۔ وہ مجُھے حوصلہ دے رہے تھے کہ خُداوند کریم نے اگر ہماری جان بچا لی ہے تو وہ اس مُشکل سے بھی ہمیں ضرور نِکالے گا۔ہمیں بالکُل خبر نہ تھی کہ آگے ایک اور بھیانک مُصیبت ہمارا اِنتظار کر رہی ہے!"

اِتنا کہہ کر اُس مردِ بُزرگ نے ذرا سا سانس لیا۔ حاتِم اُس کے پاس بیٹھا بڑی توجُّہ سے اُس کی دِلچسپ آپ بیتی سُن رہا تھا۔ بُزرگ نے کہانی بیان کرتے ہُوئے کہا :

"دُوسرے روز شام کے وقت ہمیں دُور سمندر میں ایک سیاہ لکیر دِکھائی دی۔میرے بیٹوں نے کہا کہ ابّا جان، یہ لکیر زمین کی ہے۔ہم بڑے خُوش ہُوئے اور خُدا

کا شکر بجا لائے کہ ہم زمین کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ سیاہ لکیر قریب آ رہی تھی۔ وہ ایک جزیرہ تھا۔ ہماری اُلٹی ہوئی کشتی اُس کے جزیرے کے ساحل سے لگ گئی اور ہم ساحل کی ریت پر جا کر لیٹ گئے۔ خُدا کا شُکر ادا کیا کہ اُس نے ہماری جان بچا لی۔

"اب شام کے سائے گہرے ہونا شرُوع ہو گئے تھے۔ جزیرے کے ساحل سے تھوڑی دُور ناریل اور کیلے کے درختوں کے جُھنڈ تھے۔ ہم نے زمین پر گرے ہوئے ناریل اُٹھا کر توڑے اور اُن کا میٹھا پانی پیا تو جان میں جان آئی۔ پھر کیلے توڑ کر کھائے۔ پیٹ کی آگ بُجھی تو غور کرنا شرُوع کیا کہ یہ جزیرہ کیسا ہے؟ کیا یہ غیر آباد ہے یا یہاں لوگ رہتے ہیں؟

پھل دار درخت بتا رہے تھے کہ وہاں ضرُور آبادی ہوگی۔ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ ایک طرف چلنے لگے۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ اچانک دس بارہ وردی پوش گھڑ سوار نمُودار ہوئے۔ اُنھوں نے ہمیں اُٹھا کر گھوڑوں پر بٹھایا اور ایک شان دار محل کے اصطبل میں لے جا کر بند کر دیا۔ ہم حیران پریشان کہ یا اللہ! یہ کون لوگ ہیں اور اُنھوں نے ہمیں کیوں

پکڑ لیا ہے!

"رات کو ہمیں بڑا عُمدہ کھانا دیا گیا۔ دِن چڑھا تو ایک چمکیلی آنکھوں والا اَدھیڑ عُمر کا آدمی ہمارے پاس مُسکراتا ہُوا آیا۔ اُس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ سر کے بال کھڑے تھے۔ وہ ڈھیلا ڈھالا لال کوٹ پہنے ہُوئے تھا اور اس کی سفید مُونچھیں اُوپر کو اُٹھی ہُوئی تھیں۔ اُس نے آتے ہی بڑے تپاک سے ہم تینوں سے ہاتھ مِلایا اور پھر کہا کہ ہم بادشاہ سلامت کے مہمان ہیں اور ہمیں سونا چاندی اور ہیرے جواہرات دے کر وہاں سے رُخصت کیا جائے گا۔ ہم بڑے خُوش ہُوئے۔ وہ آدمی چلا گیا۔

"دوپہر کو بھی ہمیں خُوب بھُنے ہُوئے مُرغ کھِلائے گئے۔ رات کا کھانا اس سے بھی زیادہ پُر تکلّف اور لذیذ تھا۔

"دُوسرے روز اُسی آدمی نے آ کر مجھ سے پُوچھا کہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا کون سا ہے۔ میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف اِشارہ کیا تو اُس شیطان صِفت اِنسان نے اُس کی گردن پر نشان لگایا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تلوار نیام سے نِکال کر اس کی گردن قلم

کر دی۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ میری آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔

"ابھی میں اِس صدمے سے سنبھل نہ پایا تھا کہ اِس اِنسان نُما شیطان نے میرے بیٹے کی گردن زمین پر سے اُٹھا کر اُس کے سر پر لگائی اور کوئی منتر پڑھ کر پُھونک ماری۔ گردن پھر اپنی جگہ پر لگ گئی اور میرا بیٹا پھر سے زندہ ہو گیا۔ اُس شیطان نے مُسکراتے ہوئے کہا، فکر نہ کرو، میں تین بار ایسا کروں گا۔ پھر تُمھارا بیٹا کبھی نہیں مرے گا۔

"چُناں چہ اے حاتِم طائی، اُس ظالم شخص نے تین بار، میری آنکھوں کے سامنے، میرے بیٹے کا سر تن سے جُدا کیا اور تینوں بار جوڑ دیا۔ تیسری بار میرا بیٹا زندہ ہُوا تو اُس کی آنکھیں سُرخ انگاروں کی طرح دہکنے لگی تھیں۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہا تھا، مگر ہمیں پہچان نہیں رہا تھا۔ اُس شیطان نے اُس کا ہاتھ تھاما اور لے کر چلا گیا۔

"دو دِن گُزر گئے۔ ہماری خاطر تواضُع اُسی طرح ہو رہی تھی، مگر ہمارا کُچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بار بار مُجھے اپنے چھوٹے بیٹے کا خیال آتا کہ

خُدا جانے وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے!

تیسرے روز وہی شیطان ہمارے پاس آیا اور یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا کہ آؤ، تمھیں تمھارے بیٹے اور بھائی سے مِلایا جائے۔ ہم بڑے خُوش ہوئے اور اُس کے ساتھ چل دیے۔

"وہ ہمیں محل کے ایک تہہ خانے میں لے گیا، جہاں اُس جزیرے کا بادشاہ بیٹھا تھا۔ بادشاہ نے ہماری طرف مُسکرا کر دیکھا اور اِشارے سے اپنے پاس آنے کو کہا۔ ہم دونوں باپ بیٹے بادشاہ کی کُرسی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے ایک کمرا تھا، جس کے دروازے پر میں نے اپنے بیٹے کو کھڑے دیکھا۔ اس نے سارے بدن پر تیل کی مالش کی ہوئی تھی، سر پر چمڑے کا سینگ والا ٹوپا پہن رکھا تھا، بدن پر صرف ایک لال رنگ کا جانگیا تھا، کندھے پر ننگی تلوار رکھی تھی اور آنکھیں سُرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ دروازے کے اندر، کمرے میں، ہیرے جواہرات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اِتنی زیادہ دولت ہم نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"اُس شیطان نے میرے بڑے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا، جاؤ، اپنے بھائی سے جا کر مل لو، اور اس کمرے

میں سے جتنی دولت اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو اور اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔ بادشاہ نے بھی سر کے اِشارے سے ہمیں اِس کی اِجازت دے دی۔ میرے بیٹے نے اپنے بھائی سے مِلنے کے شوق میں دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ اس کا بھائی پتّھر کا بُت بنا، تلوار کندھے پر رکھے، کھڑا تھا۔ میرا بڑا بیٹا کمرے میں داخل ہُوا تو اُس کے بھائی نے کوئی حرکت نہ کی۔ میرے بڑے بیٹے نے بہت سے جواہرات اور سونا اُٹھا کر جیبوں میں بھر لیا، اور کمرے سے نِکلنے کے لیے مُڑا ہی تھا کہ اچانک اس کے چھوٹے بھائی کے جسم میں حرکت ہُوئی۔ اُس نے ایک خوف ناک چیخ ماری اور تلوار کے ایک بھرپُور وار سے اپنے بڑے بھائی کا سر تن سے جُدا کر دیا، اور پھر واپس اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

"میں غم سے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اُس وقت اِنسان نُما شیطان نے بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا، حُضُور، جس پہرے دار نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا ہے، آپ خُود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بھلا کسی غیر شخص کو خزانے کا سونا چُرانے دے گا۔ آپ کا خزانہ اب

ہمیشہ محفوظ رہے گا اور کوئی چور اندر داخل ہو کر زندہ باہر نہیں جا سکے گا۔

"اب میں سمجھا کہ یہ شیطان تو میرے چھوٹے بیٹے پر کوئی طلسم کر رہا تھا۔ میرا ایک بیٹا مر چکا تھا اور دُوسرا موت سے بھی بدتر حالت میں تھا۔

"اُن لوگوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا۔ اس خیال سے کہ میں اُن کا راز لے کر جزیرے سے بھاگ نہ جاؤں، اُنھوں نے مجھے بھی قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن ایک سپاہی کو میری حالت پر رحم آ گیا اور اُس نے مجھے جیل سے نکال کر جزیرے کے جنوب میں ایک دریا کے پاس پہنچا دیا۔ وہاں میں سارا دن چھپا بیٹھا رہا۔ آدھی رات کو وہی سپاہی ایک چھوٹی سی کشتی لے کر آیا اور کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے بھاگ جاؤ۔

"بس میں کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں نکل آیا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ ایک تجارتی جہاز کے کپتان نے مجھے دیکھ لیا اور اُس مجھے افریقہ کی ایک بندرگاہ پر پہنچا دیا۔ وہاں سے مصیبتیں اُٹھاتا کراچی اور پھر اپنے شہر آ گیا۔ اب مجھے اپنے دونوں بیٹوں کی یاد خون کے

آنسو رُلاتی ہے۔ ایک تو مر گیا، اُس کا صبر آ گیا۔ مگر چھوٹا بیٹا یاد آتا ہے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اے حاتم، کیا تُم میرے بیٹے کو، پہلے جیسا کر کے میرے پاس لا سکتے ہو؟"

بُزرگ نے اپنی درد بھری آپ بیتی ختم کی تو حاتم طائی نے سوچا کہ یہ تو واقعی بڑی دُکھ بھری کہانی ہے۔ ایسی کہانی اُس نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ اُس نے اِس غم زدہ باپ کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

آدم خوروں کا جزیرہ

حاتم طائی نے مردِ بُزرگ سے اُس اجنبی جزیرے کا پتا پُوچھا۔

بُزرگ نے بتایا کہ بحیرۂ عرب میں جنُوب کی طرف سمُندر میں چھ روز تک سفر کرتے جائیں تو وہ جزیرہ آ جاتا ہے۔ اُس جزیرے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کے ساحل پر سمُندر کے رُخ ایک اُونچا سفید مینار بنا ہُوا ہے، جس کا گُنبد سُرخ رنگ کا ہے۔ بُزرگ نے کہا :

"وہاں کے بادشاہ کے محل کے گُنبد کا رنگ بھی سُرخ ہے اور سپاہیوں کی وردیاں بھی سُرخ ہیں۔ شاہی محل کے ایک تہہ خانے میں بادشاہ کا خزانہ ہے، اور وہیں میرا بیٹا جلّاد بنا پہرا دے رہا ہے وہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ جو بھی دروازے کے اندر داخل ہوتا ہے، اُس کو قتل کر دیتا ہے۔"

حاتم طائی نے بُزرگ کو تسلّی دیتے ہُوئے کہا "آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ میں ایک نہ ایک دن اُسے ضرور واپس لے آؤں گا، اور اُس شیطان صفت جادُوگر کو اس کے گُناہوں کی سزا دُوں گا۔ اب آپ گھر جا کر آرام کریں اور میرا انتظار کریں۔ میں جلد واپس لوٹ آؤں گا۔"

بُزرگ نے ایک آہ بھری اور کہا "یقین نہیں آتا کہ تُم اِتنی بڑی مُصیبت کا مُقابلہ کر سکو گے۔ میری دُعا ہے کہ خُدا تُمھیں سُرخ رُو کرے۔ تُم محض اِنسانی ہمدردی کے لیے ایک دُکھی باپ کی مدد کر رہے ہو۔"

حاتم اُسی روز ریل میں سوار ہو کر کراچی روانہ ہو گیا۔ اُس کے پاس صرف کراچی تک کا ہی کرایہ

تھا۔ کراچی پہنچ کر اُس نے سوچا کہ اب سمندری جہاز کا خرچ کس طرح سے پورا ہوگا۔ اُس کے پاس تو پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ یہاں سے کوئی مال خرید کر بحرین لے جا کر فروخت کرنا چاہیے۔ اس سے جو مُنافع ہوگا اُس سے ایک کشتی خرید کر جزیرے تک سفر کروں گا۔ لیکن مال خریدنے کے لیے پیسہ چاہیے تھا۔ اُس نے بندرگاہ پر محنت مزدوری شروع کر دی، اور تین مہینے کی مزدوری کے بعد اُس کے پاس کچھ روپے جمع ہو گئے۔ اُس نے اُن روپوں سے بحرین کا ایک ٹکٹ اور تجارت کا کچھ مال خریدا۔

اور یوں ایک روز حاتم ڈمرا نامی سمندری جہاز پر سوار ہو کر بحرین کی جانب روانہ ہو گیا۔ بحرین تک کا سفر بڑے آرام سے گزرا۔ یہ سرزمین حاتم طائی کی دیکھی ہوئی تھی، مگر آج سے کئی سو سال پہلے، جب اس علاقے کا نام بحرین نہیں تھا، اور یہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ بس ہر طرف ریت کا صحرا ہی صحرا تھا۔

بحرین میں حاتم نے اچھے داموں مال فروخت کیا اور

پھر اُس نے ایک کارخانے میں مُلازمت کر لی۔ وہ عرب تھا، اور بڑی روانی سے عربی بولتا تھا۔ تین مہینے بعد اُس نے کافی روپے جمع کر لیے۔

چھ مہینے بحرین میں رہنے کے بعد اُس نے ایک بادبانی کشتی خریدی، اس میں دو مہینے کے لیے کھانے پینے کا سامان رکھا، دو حبشی نوکر ساتھ لیے اور ایک روز موسم، خوش گوار دیکھ کر، جنوب کی طرف سفر شروع کر دیا۔ سمندر پُرسکون تھا۔ موسم میں ہلکی ہلکی خُنکی تھی۔ دِن خیر و خوبی سے گزر گیا اور رات آ گئی۔ حاتم نے اپنے حبشی نوکروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پھر حبشی گٹار لے کر ڈیک پہ بیٹھ گئے اور سوڈان کے لوک گیت گانے لگے۔

حاتم نے سمندروں کا ایک نقشہ اور کمپاس بھی خرید لی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے سے کیبن میں بیٹھ کر نقشہ دیکھنے لگا۔ نقشے پہ ایک جزیرے کا معمولی سا نشان تھا۔ اگر بُزرگ کی کہانی سچّی تھی تو پھر یہی وہ جزیرہ تھا جہاں حاتم طائی کو پہنچنا تھا۔ ساری رات بادبانی کشتی سمندر کی لہروں پہ ٹھیک رُخ پر سفر کرتی رہی۔

اسی طرح جب پانچ روز گُزر گئے تو دُور سے

حاتم نے زمین کی سیاہ لکیر دیکھی۔ وہ خوش ہوا کہ منزل پر پہنچ گیا ہے۔ مگر وہ جزیرہ کوئی اور تھا۔ لوگ خوش حال تھے۔ یہاں حاتم کو معلوم ہوا کہ جس جزیرے پر وہ جانا چاہتا ہے وہ وہاں سے جنوب مشرق کی جانب چھ روز کی مسافت پر ہے۔ جزیرے کے بوڑھے ماہی گیر نے حاتم طائی سے پوچھا "تم اس جزیرے میں کیوں جانا چاہتے ہو؟"

حاتم نے کہا کہ وہ اپنے ایک بھائی کی تلاش میں وہاں جا رہا ہے۔ اس کے بارے میں اطّلاع ملی ہے کہ وہ وہاں رہتا ہے۔

بوڑھے ماہی گیر نے کہا "نوجوان، بہتر یہی ہے کہ یہاں سے واپس چلے جاؤ اور اس جزیرے پر جانے کا خیال دل سے نکال دو۔"

"وہ کیوں؟" حاتم نے پوچھا۔

ماہی گیر کہنے لگا "اس لیے کہ اس جزیرے میں آدم خور قبیلے آباد ہیں اور وہاں ایک ایسے جادوگر کی حکومت ہے جو اجنبی لوگوں کو طلسمی پتلے بنا کر اپنے تہہ خانے میں بند کر دیتا ہے۔"

ماہی گیر کے بیان سے مردِ بزرگ کی کہانی کی

تصدیق ہوتی تھی ۔ حاتم یہ جان کر خُوش ہوا کہ وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ گیا ہے ۔ اُس نے ماہی گیر سے کہا :

”میں اُسی جزیرے میں جانے کے لیے گھر سے نِکلا ہُوں ، اور پاکستان سے یہاں تک بڑا لمبا سفر کیا ہے ۔ اب میں اپنا مقصد پُورا کیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا ۔“

اُس نے جزیرے میں کُچھ مال فروخت کیا ، پھر کھانے پینے کی چیزیں خرید کر کشتی میں رکھیں اور ایک روز مُنھ اندھیرے کشتی کو سمندر میں جنُوب مشرق کی طرف ڈال دیا ۔

ہوا چل رہی تھی ۔ بادبانی کشتی خاصی رفتار سے منزل کی طرف روانہ ہو گئی ۔ دونوں حبشی حاتم کے ساتھ تھے ۔ وہ کھانا پکاتے ، پھٹے ہُوئے بادبانوں کی مرمّت کرتے ، کشتی کی صفائی کرتے ، کوئی رسّی ٹُوٹ جاتی تو اُسے جوڑ دیتے ۔

حاتم دِن بھر یا تو نقشہ دیکھتا یا آرام کرتا ، یا پھر کشتی کے عرشے پر آ کر دُور سمندری لہروں کو تکا کرتا کہ شاید کہیں زمین نظر آ جائے ۔ اُس کے حساب سے

جزیرہ چار دِن کے بعد نظر آ جانا چاہیے تھا، مگر ماہی گیر نے بتایا کہ ساتویں روز جزیرے کے ناریل کے درخت نظر آنے لگیں گے۔ کشتی کو سمندر میں سفر کرتے تیسرا دِن تھا کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

دوپہر کے وقت ایک حبشی مُلازم کھانا کھانے کے بعد عرشے پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا کہ اچانک سمُندر میں گر پڑا۔ اُسے بچانے کے لیے دُوسرے حبشی نے بھی چھلانگ لگا دی۔ دونوں ماہر تیراک تھے اور اُن کی ساری زندگی سمُندر ہی میں گزُری تھی مگر بدنصیبی یہ ہُوئی کہ اُن کے سمندر میں گرتے ہی دو شارک مچھلیاں اُن کی طرف لپکیں۔

یہ بڑی خُوں خوار شارکیں تھیں۔ دونوں حبشی تیزی سے کَشتی کی طرف تیر رہے تھے کہ شارکیں اُن کے سر پر پُہنچ گئیں۔ ایک شارک نے ایک حبشی کو نیچے سے اُوپر اُچھالا تو دُوسری شارک نے اپنا نوکیلے دانتوں والا جبڑا کھول دیا۔ حبشی سیدھا شارک کے جبڑوں میں آ کر گِرا۔ شارک نے چبا کر اُس کے دو ٹُکڑے کر دیے۔

دُوسری شارک نے دُوسرے حبشی کی تکّا بوٹی کر ڈالی۔

سمندر اُن کے خون سے سُرخ ہو گیا۔ حاتم اپنی آنکھوں سے یہ سارا خونی تماشا دیکھتا رہا مگر کچھ نہ کر سکا۔

اب حاتم اکیلا رہ گیا تھا۔ شارک مچھلیاں اپنے لال لال جبڑے کھولے کشتی کے گرد گھومتی دیر تک اُمید پر چکر لگاتی رہیں کہ شاید کوئی اور شکار سمندر میں چھلانگ لگا دے۔ حاتم نے عرشے پر سے دو خنجر شارکوں پر پھینکے، مگر اُن خنجروں سے بھلا اُن کا کیا بگڑ سکتا تھا۔

وہ دن بھی گزر گیا۔ اب کشتی پر سارا کام حاتم کو خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ چھٹے روز سمندر میں اچانک طوفان آ گیا۔ طوفان اس قدر زور دار تھا کہ دن کے وقت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ہوا آندھی کی طرح شور مچانے لگی اور کشتی نے لہروں پر ڈولنا شروع کر دیا۔ اس قسم کے طوفان حاتم نے بہت دیکھے تھے۔ گھبرانے کے بجائے اُس نے لکڑی کے ایک تختے کو پکڑ لیا تا کہ اس پر بیٹھ کر ڈوبنے سے بچ سکے۔

طوفان بہت زبردست تھا۔ بڑی بڑی سمندری لہریں کشتی کو اُوپر نیچے اُچھال رہی تھیں۔ آخر ایک لہر نے کشتی کو اُلٹ دیا۔ حاتم نے تختہ مضبوطی سے پکڑا

اور پھر چھلانگ لگا دی۔ اُس نے پلاسٹک کا ایک تھیلا پہلے ہی سے تختے کے ساتھ باندھ دیا تھا، جس میں کُچھ پھل اور پانی کی چند بوتلیں تھیں۔

سمُندر کی طوُفانی موجیں حاتم کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔ تختہ کبھی لہروں کے اندر چلا جاتا اور کبھی باہر آ جاتا۔ آخر خُدا خُدا کر کے، شام کے وقت، طوُفان تھم گیا۔ لیکن اب بارش شرُوع ہو گئی اور آدھی رات تک ہوتی رہی۔

رات کے پچھلے پہر بارش رُک گئی اور آسمان پر چاند نِکل آیا جس کی زرد زرد چاندنی سمُندر پر پھیل گئی۔ یہ منظر بڑا خوُب صوُرت تھا۔ مگر حاتِم مُصیبت میں پھنسا ہُوا تھا۔ اُسے اس منظر سے کوئی دِل چسپی نہ تھی۔ تختہ اب تیزی سے بہنے لگا تھا۔ حاتِم کے تجربے نے اُسے بتایا کہ تختے کی رفتار میں اس لیے تیزی آ گئی ہے کہ کوئی جزیرہ قریب ہے۔

اُس کا اندازہ دُرست نِکلا۔ صُبح کی روشنی پھیلی تو اُس نے دُور زمین کی لکیر دیکھی۔ یہ لکیر آہستہ آہستہ قریب آتی گئی۔ پھر آسمان پر کُچھ مُرغابیاں اُڑتی ہوئی گزر گئیں۔ یہ زمین کی نشانیاں تھیں۔ حاتِم بڑا

خُوش ہُوا کہ سمُندر کی مُصیبت سے تو جان چھُوٹی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا یہ وہی جزیرہ ہے جہاں ایک بدنصیب باپ کا بیٹا قید ہے؟

جزیرے کا ساحِل قریب آ گیا تو حاتم کی نگاہیں اُس مینار کو تلاش کرنے لگیں جس کا گُنبد سُرخ تھا اور جو اُس جزیرے کی خاص نشانی تھی۔ آخر اُس کی نظروں نے یہ مینار تلاش کر ہی لیا۔ مینار کا سُرخ گُنبد ناریل کے درختوں کے اُوپر دُھوپ میں چمک رہا تھا۔ حاتم نے سجدۂ شُکر ادا کیا کہ اُس کی محنت بر آئی۔

جزیرے کا ساحِل اب قریب آ گیا تھا۔ حاتم نے محسُوس کیا کہ اُس کا تختہ جزیرے کے مشرقی ساحِل کی طرف جا رہا ہے۔ سُرخ گُنبد والا مینار اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور تختہ جزیرے کے مشرقی حِصّے میں ایک جگہ چٹانوں کے بیچ میں، ساحِل کی ریت پر، چڑھ کر رُک گیا۔

حاتم طائی نے پلاسٹک کے تھیلے میں سے کچھ پھل نِکال کر کھائے اور پھر بوتل سے پانی پیا۔ اس کے بعد تختے سے اُتر کر ساحل پر آ گیا اور ناریل اور کیلے کے درختوں کے دُور تک پھیلے ہُوئے جھُنڈوں

کو دیکھنے لگا۔ اُسے کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جزیرے کا یہ علاقہ بالکل ویران تھا۔ اُس نے سوچا کہ اب شاہی محل کی طرف جانا چاہیے۔

وہ یُونہی، درختوں کے ساتھ ساتھ، مغرب کی طرف چل پڑا۔ بائیں جانب کیلے کے درختوں کے جھُنڈ دُور تک چلے گئے تھے۔ اُن کی چھاؤں بڑی ٹھنڈی تھی۔ حاتم کو بھُوک بھی لگ رہی تھی۔ اُس نے سوچا کیوں نہ درخت سے کیلے توڑ کر کھائے جائیں۔

کیلے سُرخ رنگ کے تھے۔ اُس نے کچھ کیلے توڑ کر کھائے اور پھر درختوں کے نیچے سے ہو کر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ کیلے کے باغ ختم ہُوئے تو ناریل کے درخت شرُوع ہو گئے۔

اس کے بعد گھنا جنگل آ گیا۔ یہاں سُورج کی روشنی بھی بڑی مُشکل سے پُہنچ رہی تھی۔ درختوں کی شاخیں ایک دُوسری میں پھنسی ہُوئی تھیں۔ اُن کے تنے ہری بھری بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کسی عجیب سے پرندے کی آواز سُنائی دے جاتی تھی۔ اس کے بعد سارے جنگل پر ایک دِل ہلا دینے والی خاموشی چھا جاتی۔ حاتِم کو اس خاموشی سے وحشت

سی محسوس ہونے لگی۔

پھر، ایک دم، اُس موت ایسی خاموش فضا میں کسی وحشی انسان کی ایک بھیانک اور دِل ہلا دینے والی چیخ بلند ہوئی۔ حاتِم طائی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کس کی چیخ تھی کہ اُسے چھ سات آدمیوں نے گھیر لیا۔ یہ سارے کے سارے جنگلی تھے۔ ان کا رنگ سیاہ اور آنکھیں سُرخ تھیں۔ جسم پر صرف ایک لنگوٹی کے سِوا اور کُچھ نہ تھا۔ اُنھوں نے دیکھتے دیکھتے حاتِم کو رسّیوں میں جکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے ایک طرف کو چل دیے۔

حاتِم پریشان ہو گیا کہ یہ کیا مُصیبت اچانک نازل ہو گئی۔ جنگل کے درمیان میں ایک جگہ خالی تھی۔ یہاں کُچھ جھونپڑے تھے۔ ان جنگلیوں نے حاتِم کو ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور پھر اُس کے اِرد گِرد ناچنے اور شور مچانے لگے۔

اِتنے میں اُن کا سردار جھونپڑے سے باہر آ گیا۔ اُس کے سر پر سفید پروں کا تاج تھا۔ ہاتھ میں کُلھاڑی تھی۔ اُس نے حاتِم کو غور سے دیکھا اور پھر اپنی زبان میں جنگلی لوگوں سے کُچھ کہا۔ اس پر وہ

سارے خاموش ہو گئے۔ حاتم سمجھ گیا کہ یہ لوگ آدم خور ہیں اور اُسے بھون کر کھانے کی تیاّریاں کر رہے ہیں۔

سردار کے حُکم پر حاتم کے اِرد گرد خُشک لکڑیاں لگا دی گئیں۔ پھر پتھّر رگڑ کر ان لکڑیوں کو آگ دِکھا دی گئی۔ دیکھتے دیکھتے آگ کے شُعلے حاتم کے گھٹنوں تک پُہنچ گئے۔

سردار، سامنے کھڑا، حاتم کے جلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ لیکن جلد ہی اُس نے محسُوس کیا کہ حاتم پر آگ کا اثر نہیں ہو رہا۔ نہ وہ تڑپ رہا ہے اور نہ جلنے سے شور مچا رہا ہے۔

حاتم درخت کے ساتھ لگا خاموش کھڑا تھا اور شعلے اس کے دائیں بائیں رقص کر رہے تھے مگر اس پر ان کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

جس رسّی سے حاتم کو درخت کے ساتھ باندھا گیا تھا وہ جلنے لگی تھی۔ آگ رسّی کو جلا رہی تھی مگر حاتم بالکُل ٹھیک ٹھاک تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری رسّی جل گئی۔ اب حاتم آزاد تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لیے اور بڑے سکُون سے

آگ کے شعلوں میں سے نکل کر باہر آ گیا۔

حاتم کو زندہ سلامت دیکھ کر وحشی لوگ اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑے۔ وہ اُسے کوئی دیوتا سمجھ رہے تھے، جس پر آگ نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ یہی حال اُن کے سردار کا بھی تھا۔ اس پر حاتم کی ہیبت طاری تھی۔ جب حاتم اس کے سامنے آیا تو سردار نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور اس کے آگے جھک گیا۔ حاتم نے عربی اور افریقہ کی ملی جلی زبان میں سردار سے پوچھا کہ کیا وہ یہ زبان سمجھ لیتا ہے۔ سردار نے سر ہلا کر کہا:

"ہاں، اے دیوتا۔ میں یہ زبان سمجھ رہا ہوں۔"

حاتم سردار کو اُس کے جھونپڑے میں لے گیا۔ سردار خوف زدہ تھا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ کوئی آسمانی دیوتا ہے جو ان لوگوں کا امتحان لینے جزیرے میں آیا ہے۔ حاتم نے سردار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"میرا نام حاتم طائی ہے۔ میں کوئی دیوتا نہیں ہوں، بلکہ ایک انسان ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ مجھ پر آگ

اثر نہیں کرتی۔"

سردار نے سر جھکا کر کہا "عظیم دیوتا، ہمیں معاف کر دے۔ ہمارا امتحان مت لے۔"

حاتم نے سوچا کہ یہ جنگلی لوگ ہیں۔ ان پر عقل کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ان کے آگے دیوتا ہی بنے رہو تو ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ اُس بزرگ کے بیٹے کی تلاش میں میری مدد کر سکیں۔ اُس نے کہا:

"اچھا، میں تم لوگوں کا امتحان نہیں لوں گا۔ میری بات غور سے سُنو۔ میں اس جزیرے میں ایک خاص کام کے لیے آیا ہوں۔"

سردار نے بڑے ادب سے کہا "عظیم دیوتا، حکم کریں۔ ہم حاضر ہیں۔"

حاتم بولا "اس جزیرے پر جس بادشاہ کی حکومت ہے، اس کا وزیر بہت بڑا جادوگر ہے۔ اُس نے میرے ایک بھائی پر جادو کر کے اُسے اپنے تہہ خانے میں قید کر رکھا ہے۔ میں اُس کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔"

سردار نے کہا "اے عظیم دیوتا، جادو اور طلسم

مجھے نہیں آتے۔ ہاں، میری ایک بہن ہے۔ اُس کا نام شارجہ جادُو گرنی ہے۔ وہ جادُو طِلسم میں ماہر ہے۔ میں تمھیں اُس کے پاس لیے چلتا ہُوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمھاری کُچھ مدد کر سکے۔"

سردار نے حاتم کو ساتھ لیا اور جنگل میں ایک گھنے اور تنگ راستے پر چل پڑا۔ جھاڑیوں اور درختوں کے کئی موڑ مُڑنے کے بعد سامنے ایک گپھا آ گئی۔ سردار نے کہا کہ اس کی بہن اس گپھا میں رہتی ہے۔ حاتم سردار کے ساتھ اندھیری گپھا میں داخل ہو گیا۔

کُنواں، اژدہا اور حاتم

شارجہ جادُو گرنی کا چہرہ بڑا ڈراؤنا تھا۔ کالا سیاہ رنگ، لال لال آنکھیں، سر پر گھُنگھریالے بالوں کا چھتّا، گلے میں سبز، لال اور زرد ہڈّیوں کی مالائیں، کالے لباس پر بنی ہُوئی اِنسان کی کھوپڑیوں کی تصویریں اور طوطے ایسی ناک۔ وہ اندھیری کوٹھڑی میں، بڑی بڑی موم بتّیاں جلائے، سامنے کھوپڑی رکھے کوئی جادُو کر رہی تھی۔

سردار حاتم کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ شارجہ جادوگرنی نے طلسم ختم کر کے کھوپڑی پر پھونک ماری اور شعلے اُگلتی آنکھوں سے حاتم طائی کو دیکھا :

"کیا یہ میرا شکار ہے ؟ مجھے کسی انسان کی بہت ضرورت تھی ، جس کی کھوپڑی نکال کر میں جادو کر سکوں۔"

جادوگرنی کے بھائی نے پریشان ہو کر کہا "بہن، یہ انسان نہیں ، دیوتا ہے۔"

جادوگرنی نے ایک ڈراونا قہقہہ لگایا۔ اس کے سامنے رکھی ہوئی انسانی کھوپڑی ہلنے لگی۔ وہ لمبے لمبے دانت نکال کر بولی :

"دیوتا ؟ یہاں دیوتا کا کیا کام ؟ یہ انسان ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے اس کی کھوپڑی کی ضرورت ہے۔ میں ابھی جادو کے زور سے اس کا سر قلم کرتی ہوں، تاکہ اس کی کھوپڑی حاصل کر سکوں۔"

حاتم طائی مسکرا رہا تھا۔ سردار نے ہاتھ جوڑ کر کہا :

"عظیم دیوتا ، میری بہن کو معاف کر دو - یہ نہیں جانتی کہ تم آسمانی دیوتا ہو۔"

شارجہ جادوگرنی پر اپنے بھائی کی بات کا کوئی

اثر نہیں ہُوا۔ اُس نے حاتِم طائی کی طرف دیکھ کر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر زور سے پھُونک ماری۔ ایک شعلہ حاتِم کی طرف لپکا اور اس کے چہرے اور سر کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہُوا بجھ گیا۔ جادُو گرنی نے بار بار حاتِم کی طرف شعلے پھینکے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔

اب تو جادُوگرنی کچھ پریشان سی ہو گئی۔ مگر وہ ہار ماننے والی نہ تھی۔ اُس نے دیوار کی طرف دیکھا۔ وہاں پتّھر کے ایک مگرمچھ کا چھوٹا سا بت پڑا تھا۔ جادُوگرنی نے منتر پڑھ کر مگرمچھ کے بُت پر آگ کا شُعلہ پھینکا اور ایک دِل دہلا دینے والی چیخ ماری۔ مگرمچھ کا بُت زندہ ہو گیا اور بڑا ہوتا گیا، یہاں تک کہ پُورا جوان مگرمچھ بن گیا۔ اُس کے مُنھ سے ایک بھیانک ڈکار کی سی آواز نِکلی اور وہ حاتِم طائیٔ کی طرف حملہ کرنے کے لیے بڑھا۔

قریب تھا کہ مگرمچھ حاتم کو اپنے خوف ناک دانتوں والے جبڑے میں جکڑ لے کہ حاتِم نے دِل میں تین بار قُلابہ کا بتایا ہُوا اِسم پڑھ کر مگرمچھ سے کہا:

"پھر پتّھر بن جا!"

اور مگرمچھ دوبارہ پتّھر کا چھوٹا سا بُت بن گیا۔ جادُوگرنی نے کھا جانے والی نظروں سے حاتِم کو دیکھا اور بولی:

"تمھاری یہ ہمّت؟ اچّھا، اب میں سب سے بڑا حملہ کروں گی۔ تم بچ کر نہ جا سکو گے۔"

جادُوگرنی کا بھائی ڈر کر وہاں سے بھاگ گیا۔ حاتِم نے اُسے روکنے کی کوشش نہ کی، کیوں کہ وہ اُس کے لیے بے کار تھا۔ جادُوگرنی نے اپنا سب سے بڑا حملہ یہ کیا کہ حاتِم کی طرف ایک تلوار اُچھالی اور اُسے حُکم دیا کہ حاتِم کا سر قلم کر دے۔ تلوار فضا میں اپنے آپ بلند ہُوئی اور پھر حاتِم کی گردن پر بڑے زور سے پڑی۔ اگر کسی دُوسرے کی گردن ہوتی، چاہے وہ گینڈا ہی کیوں نہ ہوتا، تو ایک پل میں کٹ کر گر پڑتی۔ مگر حاتِم کی گردن پر تلوار لگی تو دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر پڑی۔

حاتِم نے جادُوگرنی سے کہا "شارجہ، اب بھی شکست مان لے۔ تیرا کوئی جادُو مُجھ پر اثر نہ کر سکے گا۔"

جادُوگرنی نے کہا "میں کبھی شکست نہیں مانوں گی۔"

حاتم نے کہا "اچھا، تو سنبھل۔ اب میں حملہ کرنے لگا ہوں۔ ہوشیار ہو جا!"

حاتم نے اِسم پڑھ کر جادُو گرنی سے کہا "پتّھر بن جا!"

جادُو گرنی جہاں کھڑی تھی وہیں پتّھر کا بُت بن گئی۔ حاتم نے قریب جا کر اس کے سر پر آہستہ سے مُکّا مارا۔ اُسے یُوں لگا جیسے اُس کا ہاتھ کسی پتّھر سے ٹکرایا ہو۔ اُس نے اُسے پھر سے زندہ کر دیا۔ جادُو گرنی پھر سے گوشت پوست کی بنی تو اُس نے اپنی ہار مان لی اور حاتِم طائی کے قدموں پر گر پڑی۔

حاتم نے کہا "اب تُم سیدھی راہ پر آئی ہو۔"

جادُو گرنی نے کہا "حاتِم، جب تمھارے پاس اِتنا زبردست جادُو ہے تو میرے پاس کس لیے آئے ہو؟"

حاتم نے کہا "شارجہ، میرے پاس کوئی جادُو نہیں ہے۔ یہ کسی کی دُعا ہے جس کی وجہ سے میرے اندر اِتنی طاقت آ گئی ہے۔ جادُو تمھارے پاس ہے اور مجھے اُس کی ضرُورت ہے۔"

"بتاؤ، میں تمھاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟" جادُو گرنی

نے پُوچھا۔
حاتِم نے وہ ساری کہانی لفظ بہ لفظ شارجہ جادُوگرنی کو سُنا دی جو اُسے مردِ بُزرگ نے دریا کے کنارے سنائی تھی۔ کہانی سُن کر شارجہ جادُو گرنی نے کہا:
"حاتِم، جس شیطان صِفت وزیر نے اُس آدمی کے بیٹے کو تین بار قتل کر کے طِلسمی پُتلے میں تبدیل کیا ہے، وہ سات سمُندروں کا سب سے بڑا جادُو گر ہے۔"
حاتِم نے پُوچھا "کیا تُم اس کے جادُو کا کوئی توڑ نہیں کر سکتیں؟"
جادُو گرنی نے کہا "کر سکتی ہُوں، لیکن اس کے لیے تُمھیں اُس طلسمی پُتلے کو میرے پاس اِس غار میں لانا ہوگا۔ میرا جادُو اُس شیطان وزیر کے محل میں نہیں چل سکتا۔"
حاتِم نے کہا "مگر وہ پُتلا تو بڑی خوف ناک حالت میں ہے۔ وہ کسی پر رحم نہیں کرتا۔ وہ میرے ساتھ کس طرح آئے گا؟ وہ تو شیطان وزیر کے طلسمی پنجے میں ہے۔"

شارجہ نے کہا "یہ میں نہیں جانتی۔ اگر تم اُسے میرے پاس لا سکتے ہو تو میں تمھاری کچھ مدد کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں۔ لیکن اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں یہاں سے کوئی ایسا جادُو کروں کہ وہ طِلسمی پُتلا پھر سے اِنسان بن جائے تو یہ ناممکن بات ہے۔"

حاتِم مُصیبت میں گھبرانا نہیں جانتا تھا۔ اُس نے ہمیشہ مُصیبت میں کُود کر ہی کامیابی حاصل کی تھی۔ اُس نے کہا:

"بہُت خُوب۔ میں اُسے تمھارے پاس لانے کی کوشش کروں گا۔"

جب وہ جانے لگا تو شارجہ جادُو گرنی نے کہا "ایک بات کا خیال رہے۔ شیطان وزیر کے محل میں، ہو سکتا ہے، تمھارا جادُو بھی جواب دے جائے۔ اس لیے خبردار رہنا۔"

حاتِم نے پُوچھا "کیا مطلب؟"

شارجہ نے راز داری سے کہا "میری بات غور سے سُنو۔ شیطانی وزیر سات سمندروں کا جادُو گر ہے۔ اُس کے پاس ہزاروں سال پُرانا طِلسم ہے۔ ہو سکتا ہے اُس پر تمھارا طِلسم اثر نہ کرے۔ اس

لیے کوشش کرنا کہ اُس کی بے خبری میں ہی تم طلسمی پُتلے کو کسی طرح وہاں سے اُٹھا کر لے آؤ۔ اگر وزیر کو پتا چل گیا یا وہ تمھارے سامنے آ گیا تو پھر تم مُصیبت میں پھنس سکتے ہو۔"

حاتم نے شارجہ سے وعدہ کیا کہ وہ ان باتوں کا خیال رکھے گا۔ پھر جاتے ہوئے پوچھا کہ شاہی محل کے اندر جانے کے لیے کوئی خُفیہ راستہ بھی ہے۔

جادُو گرنی نے کہا " جزیرے کی شمالی چٹانوں میں ایک چٹان بھُورے رنگ کی ہے۔ اس کے اندر ایک دلدلی غار ہے جس میں مگرمچھ رہتے ہیں۔ یہ وزیر کے مگرمچھ ہیں اور کسی کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ اسی غار میں سے ہو کر شاہی محل کو ایک سُرنگ جاتی ہے۔"

حاتم نے جادُو گرنی سے اجازت لی اور گپھا سے باہر نکل آیا۔ باہر وحشی آدم خوروں کا سردار اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ حاتم کو دیکھ کر وہ تعظیم سے جُھک گیا۔ حاتم نے اُس سے شمالی چٹانوں کا راستہ پُوچھا تو اُس نے سہم کر کہا :

"عظیم دیوتا ، وہاں تو خوں خوار مگرمچھوں کا راج

ہے۔ اُدھر جو بھی گیا، پھر واپس نہ آ سکا۔"
حاتم نے کہا "میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ تُم مجھے وہاں تک چھوڑ کر واپس آ جانا۔"
دوپہر کو حاتم نے ہرن کا گوشت اور پھل کھائے۔ پھر اُسے سردار شمالی چٹانوں کے پاس لے گیا اور ایک بھُوری چٹان کی طرف اشارہ کرکے بولا:
"عظیم دیوتا، یہ ہے وہ چٹان جہاں سے ایک سُرنگ شاہی محل کو جاتی ہے اور جہاں خُوں خوار مگرمچھ رہتے ہیں۔"
اِتنا کہہ کر وحشی سردار واپس چلا گیا۔ حاتم بھُوری چٹان کی طرف بڑھا۔ آسمان پر بادل چھانا شرُوع ہو گئے تھے۔ سُورج بادلوں میں چھُپ گیا تھا۔ سمُندر کی جانب سے ٹھنڈی اور مرطُوب ہوا چلنے لگی تھی۔ حاتم مگرمچھوں کے غار کی طرف بڑھا۔ غار کا مُنھ بھُوری چٹان کے نیچے تھا، جیسے کسی نے ریت کھود کر بنایا ہو۔ یہ ایک مرد جتنا اُونچا تھا اور آدمی جُھکے بغیر اندر جا سکتا تھا۔
لیکن اندر جانا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ کیوں کہ مگرمچھوں کی دہشت ناک آوازیں دُور سے

سُنائی دے رہی تھیں لیکن حاتم کو ہر حالت میں شاہی محل کے تہہ خانے تک پہنچنا تھا اور وہاں تک جانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ اُس نے خُدا کو یاد کیا اور غار کے اندر داخل ہو گیا۔

غار کی زمین دلدلی تھی۔ حاتم کے پاؤں دلدل میں دھنس رہے تھے۔ وہ تھوڑی دُور گیا ہوگا کہ مگرمچھوں کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ حاتم رُک گیا۔ غار کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے دو بدصُورت خوں خوار مگرمچھ، اپنے خُونی دانت نِکالے، حاتم کے سامنے آ گئے اور پُورے جبڑے کھول کر رونگٹے کھڑے کر دینے والی آوازیں نِکالنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ حاتم کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اُسے زندہ ہڑپ کر جائیں۔ ایک مگرمچھ سے صبر نہ ہو سکا۔ شِکار اُس کے سامنے تھا۔ وہ دلدل میں تھوڑا سا آگے بڑھ کر اُچھلا اور حاتم پر حملہ کر دیا۔

حاتِم جلدی سے پرے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اب دُوسرا مگرمچھ بھی حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ حاتِم نے قلابہ کا اِسم

تین بار پڑھا اور مگرمچھوں کی طرف دیکھ کر کہا :
"غائب ہو جاؤ !"

اِن الفاظ کے ساتھ ہی دونوں مگرمچھ، پلک جھپکنے میں، غائب ہو گئے۔ اب غار خالی تھا۔ حاتم میدان صاف پا کر آگے بڑھا۔ غار میں اندھیرا تھا۔ پھر بھی حاتِم کو غار کی دیواریں دِکھائی دے رہی تھیں۔ غار کا موڑ آ گیا۔ حاتِم موڑ گھوما تو سامنے ایک بہت بڑا مگرمچھ کیچڑ میں لت پت پڑا حاتِم کو دیکھ کر سسکار رہا تھا۔ اتنا بڑا مگرمچھ حاتِم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی وجہ سے غار کا راستہ بند ہو گیا تھا۔

مگرمچھ حاتِم پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا تو حاتِم نے اِسم پڑھ کر اُسے بھی غائب کر دیا۔ اگر وہ اُسے پتّھر بنا دیتا تو آگے نہیں جا سکتا تھا۔

غار کا راستہ صاف ہو چُکا تھا۔ حاتِم نے غار میں آگے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پُہنچا جہاں اُوپر سے، سُرنگ میں، روشنی آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُوپر کوئی روشن دان بنایا گیا ہے۔ سُرنگ کی چھت پر

لوہے کا ایک چوکور چھوٹا سا جنگلا لگا ہُوا تھا۔ وہ آگے کو چلا۔ سُرنگ برابر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی دائیں جانب گھُوم جاتی، کبھی بائیں طرف کو گھُوم جاتی۔ روشنی کا جگہ جگہ اِنتظام تھا، جو اُوپر کے چھوٹے روشن دان میں سے آتی تھی۔

ایک جگہ سیڑھیاں آگئیں جو اُوپر کو جاتی تھیں۔ حاتِم زینہ چڑھ کر اُوپر گیا تو سُرنگ بائیں جانب کو گھُوم گئی۔ ذرا آگے جا کر پھر ایک سیڑھی نیچے اُتری اور سُرنگ سیدھی ہو گئی۔ یہاں اُس نے لوہے کا ایک جنگلا دیکھا جس نے سُرنگ کے راستے کو بند کر دیا تھا۔

حاتِم نے قُلابہ کا اِسم پڑھ کر جنگلے کو غائب کر دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک چیخ فضا میں بلند ہُوئی۔ یہ چیخ کسی درندے کی تھی اور شیر سے مِلتی جُلتی تھی۔

حاتِم دیوار کی اوٹ میں ہو گیا، کیوں کہ اُس نے دُھندلی روشنی میں ایک درندے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔ ابھی وہ سنبھل ہی رہا تھا کہ ایک بڑے خوف ناک شیر نے اُچھل کر

اُسے دبوچ لیا اور پُوری طاقت سے پنجہ اُس کی گردن پر مارا۔ اگر حاتم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اُس کی گردن ٹُوٹ کر دُور جا پڑتی۔ مگر ہُوا یہ کہ شیر کا پنجہ حاتم کی لوہے ایسی گردن سے ٹکرانے کے بعد ٹُوٹ کر دُور جا گرا۔

شیر غضب ناک ہو کر دھاڑا۔ اب حاتم سنبھل گیا تھا۔ اُس نے شیر کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر سر سے اُوپر اُٹھایا اور زور سے گھُما کر دیوار کے ساتھ دے مارا۔ شیر کا سر دیوار سے ٹکرایا تو اُس کی کھوپڑی پچک گئی۔

شیر کی لاش سُرنگ میں چھوڑ کر حاتم طائی پھر آگے بڑھا۔ سُرنگ کافی لمبی تھی اور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

آخر سُرنگ کا آخری دروازہ آ گیا۔ اس دروازے کے بیچ میں ایک حبشی لنگوٹ باندھے، ہاتھ میں لمبی تلوار لیے کھڑا تھا۔ اُس کا کالا بدن چمک رہا تھا اور وہ گینڈے کی طرح طاقت ور تھا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کالا حبشی ٹکٹکی باندھے حاتم کو دیکھ رہا تھا۔ حاتم

رُک گیا اور سوچنے لگا کہ اِس حبشی سے کِس طرح نمٹا جائے!

وہ اُسے غائب کرنے ہی والا تھا کہ حبشی نے ایک زور دار چیخ ماری۔ ایسی چیخیں جنگلی لوگ دُشمن پر حملہ کرتے وقت مارا کرتے ہیں۔ چیخ بے حد ڈراؤنی اور دہشت ناک تھی۔ ایک بار تو حاتم کا دِل بھی دہل گیا۔ اِتنے میں حبشی تلوار لے کر حاتم کے سر پر پُہنچ گیا اور پُوری طاقت سے تلوار اُس کے سر پر ماری۔

لیکن حبشی کی تلوار حاتم کے سر سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو کر گِر پڑی۔ حاتم کے سر پر ذرا سی بھی چوٹ نہ لگی۔ حبشی شاید کوئی جادُو کا پُتلا تھا کہ جُوں ہی اُس کی تلوار ٹُوٹی، وہ بھی زمین پر بے جان ہو کر گر پڑا۔ حاتم اُس کے اُوپر سے پھلانگ کر محل کو جانے والی سُرنگ کے آخری دروازے میں داخل ہو گیا۔ یہاں سُرنگ کی دیواروں پر پتھر کی بڑی بڑی اِینٹیں لگی ہوئی تھیں اور سُرنگ کے ہر موڑ پر ایک مشعل جل رہی تھی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ سُرنگ شاہی محل کے

نیچے آ چکی تھی۔

حاتم آگے بڑھتا چلا گیا۔ اُدھر بادشاہ کے جادوگر شیطان وزیر کو حاتم کے آنے کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ حاتم کے پاس کوئی زبردست طلسم ہے جس کی مدد سے وہ سُرنگ کی ساری رکاوٹوں کو دُور کرتا، مگرمچھوں اور شیر کو ہلاک کرتا، آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اُس نے اپنے سب سے بڑے طلسم کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

حاتم سُرنگ میں ایک ایسی جگہ آ گیا تھا جہاں سنگِ مرمر کا زینہ اُوپر جاتا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آیا تو اُس کے سامنے ایک گول کمرا تھا جس کی چھت سے اِنسانی ہڈّیوں کے پنجر اور کھوپڑیاں لٹک رہی تھیں۔ درمیان میں ایک کنواں تھا جس میں سے تھوڑی دیر بعد کسی اژدہے کے سِسکارنے اور پھنکارنے کی آواز آ رہی تھی۔

حاتم طائی نے جُھک کر کنوئیں میں جھانکا۔ نیچے ایک اژدہا مُنھ کھولے اُوپر دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ تیّار تھا کہ کوئی شِکار اُوپر سے گرے اور وہ

اُسے دبوچ کر اُس کی تِکّا بوٹی کر دے۔ حاتم پیچھے ہٹ گیا۔ اِتنے میں سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ نمُودار ہوا۔ حاتم نے دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اُس کی چھوٹی سی سفید ڈاڑھی تھی۔ یہ وزیر جادُوگر تھا۔ وہ ایک زبردست طِلسم لے کر وہاں آیا تھا اور حاتِم طائی کو گرفتار کر کے کڑی سزا دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ حاتِم نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا:

"تُم کون ہو؟"

شیطان وزیر نے جواب دیا "میں اس جزیرے کے بادشاہ کا وزیر اور شاہی جادُوگر جاکُوف ہُوں۔ میں جانتا ہُوں کہ تُم کون ہو اور یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ مگر یاد رکھو! اپنی تمام طاقت کے باوجُود تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔"

حاتِم نے ہنس کر کہا "تُم میری طاقت سے بے خبر ہو۔ تمھیں معلُوم نہیں ہے کہ میرے اندر کون کون سی طاقت پوشیدہ ہے۔"

جادُوگر جاکُوف بولا "تُم اپنا جادُو آزما سکتے ہو۔"
حاتِم نے کہا "میں اب بھی تمھیں خبردار کرتا ہُوں کہ مُجھ سے ٹکّر لینے کی کوشش نہ کرو، اور تُم نے ایک غریب باپ کے جس بیٹے کو طِلسمی پُتلا بنا کر قید کر رکھا ہے اُسے میرے حوالے کر دو۔"
جادُوگر نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا :
"حاتم طائی، تم بھُول رہے ہو کہ اس وقت تمھارے سامنے سات سمندروں کا سب سے بڑا جادُوگر کھڑا ہے۔ پہلے تُم وار کرو، تاکہ تمھارے دِل میں کوئی حسرت نہ رہ جائے۔"
حاتِم کو بڑا غصّہ آیا۔ اُس نے سوچا کہ اِس ظالم جادُوگر کو ختم کر دینا چاہیے۔ اُس نے اپنے دِل میں تین بار اِسم پڑھا اور جاکُوف جادُوگر کی طرف اِشارہ کرکے کہا :
"ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جا!"
اسی لمحے ایک شعلہ زمین پر سے بلند ہُوا۔ اُس نے جاکُوف جادُوگر کے اِرد گرد ایک دائرہ بنا دیا اور پھر بجُھ گیا۔ جاکُوف جادُوگر غائب نہیں ہُوا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مُسکرا رہا تھا!

حاتِم کو پہلی بار ناکامی ہوئی تھی۔ وہ بڑا پریشان ہُوا۔ دُوسری بار اِسم پڑھ کے جادُوگر کو غائب ہونے کے لیے کہا، لیکن اس بار بھی اُس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ تیسری بار حاتِم نے جادُو گر کو پتّھر بن جانے کا حُکم دیا۔ مگر وہ ویسے ہی کھڑا مُسکراتا رہا۔ اب تو حاتِم گھبرا گیا۔ اُس نے بلند آواز سے کہا:

"اے قُلابہ، اپنے طِلسم سے اس شخص کو پتّھر بنا دے! غائب کر دے! پتّھر بنا دے! غائب کر دے! پتّھر بنا دے!"

لیکن کُچھ بھی نہ ہُوا۔ جاکُوف جادُوگر اپنی جگہ پر بڑے مزے سے کھڑا مُسکراتا رہا۔ جب جادُوگر نے دیکھا کہ حاتِم عاجز ہو چُکا ہے تو اُس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور کہا:

"حاتم، میں نہ کہتا تھا کہ تُمھارا کوئی جادُو مُجھ پر اثر نہیں کرے گا۔ اب تُم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ میں نہ تو غائب ہُوا ہُوں اور نہ پتّھر بنا ہُوں۔ لو، اب میں وار کرنے لگا ہُوں۔ تیّار ہو جاؤ۔"

حاتِم بے بس کھڑا تھا اور کُچھ نہیں کر سکتا تھا۔

جاکوٹ جادُوگر نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور منتر پڑھ کر حاتم پر پھُونکا۔ حاتم کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ اپنے آپ زمین سے کوئی پانچ فٹ اُوپر جا کر ہوا میں لٹک گیا۔ پھر وہ فضا میں ہی آگے کو کھِسکتا ہُوا کنویں کے اُوپر آ گیا اور وہیں سے آہِستہ آہِستہ کنویں کے اندر جانے لگا۔ باہر جاکوٹ جادُوگر کے منحُوس قہقہے گُونج رہے تھے اور کنویں کے اندر اژدہے کی پھُنکاریں بلند ہو رہی تھیں۔

کُنویں میں اُتر کر حاتم ایک دم اژدہے کے جبڑوں میں جا گرا۔ اِس قِسم کی مُصیبت سے اس کو پہلی بار پالا پڑا تھا۔ اژدہے کے جبڑے پُورے کھُلے ہُوئے تھے اور حاتم آدھا اُس کے مُنہ میں چلا گیا تھا۔ اژدہے نے اپنے نوکیلے دانتوں کو بند کر لیا۔ حاتم کو اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ قُلابہ نے اُس سے ساری طاقت واپس لے لی ہے، یا پھر جادُوگر جاکوٹ کے آگے اُس کا طِلسم نہیں چل سکا۔ اور اب اژدہا اُسے کوئی دم میں نِگل لے گا۔

حاتِم نے خُدا کو یاد کیا اور مرنے کے لیے تیّار ہو گیا۔ مگر اُسے یہ خبر نہیں تھی کہ جاکُوف جادُوگر کا طِلسم اُس سے دُوسری طاقت نہیں چھین سکا تھا۔ وہ مر نہیں سکتا تھا۔ اس کا اندازہ اُسے اُس وقت ہُوا جب اژدہے نے تڑپ کر حاتِم طائی کو اپنے جبڑوں سے اُگل دیا۔ اُس کے کِتنے ہی دانت ٹُوٹ چُکے تھے۔ حاتِم کا جِسم پتّھر سے بھی زیادہ سخت تھا۔

حاتِم نے خُدا کا شُکر ادا کیا کہ اُس کی ایک طاقت ابھی تک اُس کے پاس تھی، ورنہ اس وقت تک وہ اژدہے کے پیٹ میں ہوتا۔ وہ کُنویں میں ایک طرف پڑا تھا اور اژدہا اپنے ٹُوٹے ہُوئے دانتوں والے جبڑے کھولے اُس کی طرف غُصّے سے دیکھتے ہُوئے پھُنکا رہا تھا۔

جاکُوف جادُوگر نے کُنویں کے اُوپر سے جھانکا اور حاتِم کو زندہ دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ اُس کا جادُو حاتِم کی دُوسری طاقت پر اثر نہیں کر سکا۔ اُس نے دو تین بار منتر پڑھ کر پھُونکا، مگر اُس کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ حاتِم نے کُنویں

میں سے آواز دی :

"جاکوف ، تم مجھے مار نہیں سکو گے ۔ تمھارا کوئی جادو ، کوئی منتر، میری موت کو میرے قریب نہ لا سکے گا ۔ یہاں تم ہار گئے ہو"

جاکوف نے جواب دیا "حاتم طائی ، ٹھیک ہے ۔ ابھی تمھاری زندگی کو میرا کوئی جادو موت میں تبدیل نہیں کر سکتا ۔ مگر تم اب قیامت تک اس اندھیرے کنویں میں اژدہے کے ساتھ رہو گے ۔ یہ زندگی موت سے بھی زیادہ بھیانک ہو گی ۔"

اس کے ساتھ ہی جاکوف کا مکروہ قہقہہ گونجا اور پھر وہ غائب ہو گیا ۔ وہ سرنگ کا آخری دروازہ ، طلسم کے زور سے ، بند کر کے جا چکا تھا ۔ اب کنواں تھا ، اژدہا تھا اور حاتم طائی تھا ۔ اژدہے نے کئی بار حاتم طائی پر حملہ کیا ، اپنا دو من وزنی سر اٹھا کر اس کی گردن پکڑی ، مگر ہر بار اسے جھٹک کر چھوڑ دیا ۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے کسی پتھر کو اپنے منھ میں دبوچ لیا ہے ۔

حاتم طائی کنویں کی دیوار سے لگا پتھروں پر بیٹھا تھا ۔ کنویں میں پانی نہیں تھا ۔ پتھر ہی پتھر

بکھرے پڑے تھے۔ جب اژدہے نے حاتم کو تنگ کرنا شروع کیا اور بار بار اپنی دُم گھما کر ہنٹر کی طرح اُس کے جسم پہ مارنے لگا تو حاتم نے اُسے ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اژدہے کی گردن دونوں بازوؤں میں دبوچ کر ایک زبردست جھٹکا دیا۔ اژدہا اس جھٹکے کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی گردن کی ہڈی تین جگہوں سے ٹوٹ گئی۔

حاتم نے اُسے بازوؤں کی گرفت سے الگ کیا تو وہ بے جان ہو کر لڑھک گیا۔

اژدہے کا کام تمام ہو چکا تھا، اور ایک پریشانی ختم ہو گئی تھی۔ اب حاتم اِطمینان سے سوچ سکتا تھا کہ کون سی ایسی ترکیب اِختیار کرے کہ اس موت کے کنویں سے نجات ملے۔

کنواں زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ حاتم اس میں صرف ٹانگیں پھیلا سکتا تھا۔ اُس نے پاؤں کنویں کی دیوار پر ٹکا کر اُوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر ہر بار پھسل کر نیچے گر پڑتا۔ کنویں کی دیوار پھسلواں بنائی گئی تھی۔

اُسے کنُویں میں بیٹھے جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ اب اُسے بھُوک پیاس نے تنگ کرنا شرُوع کر دیا تھا۔ بھوک پر تو وہ قابُو پا سکتا تھا، مگر پیاس نے اُس کی زبان کو لکڑی کی طرح خُشک کر دیا تھا۔ کہنے کو تو وہ کنُواں تھا مگر پانی کی ایک بُوند دِکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اُس نے کنویں کی گول دیوار کو جگہ جگہ سے ٹھونک بجا کر دیکھنا شرُوع کیا۔ ایک جگہ ہاتھ مارنے پر اندر سے کھوکھلی سی آواز آئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دُوسری طرف کوئی سُرنگ ہے۔ وہ پتّھر کو اُکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر کُچھ دیر بعد اِینٹ اپنی جگہ سے ذرا سی کِھسکی۔ حاتِم کا ہاتھ پتّھر کی اِینٹ پر پُوری طرح سے پڑ گیا تو اُس نے جھٹکا دے کر اینٹ کو باہر کھینچ لیا۔

دُوسری طرف سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ اس مرطُوب ہوا میں پانی کی مہک بھی تھی۔ حاتم نے سُوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہاں، کسی جانب سے پانی کے قطرہ قطرہ گرنے کی ہلکی سی

آواز ضرور آ رہی تھی۔ اُس نے تھوڑی سی کوشش کے بعد پتھر کی چھ سات اینٹیں اُکھاڑ کر اِتنا راستہ بنا لیا کہ جُھک کر کنُویں میں سے دُوسری طرف جا سکے۔ اُس نے خُدا کا نام لیا اور دُوسری طرف اُتر گیا۔

اُس کے پاؤں گیلی زمین پر لگے۔ وہ جگہ کنُویں سے کوئی دو فٹ نیچی تھی۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ کچُھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے جُھک کر ہاتھوں سے زمین کو چھُوا۔ وہاں کیچڑ تھی۔ پانی کی آواز اب کچُھ صاف ہو گئی تھی۔ اُس نے ہاتھوں سے دیواروں کو ٹٹولا تو اِحساس ہُوا کہ وہ ایک سُرنگ ہے جس کی پتھریلی دیواروں میں سے پانی کی نمی رِس رہی تھی۔ حاتم نے اللہ کا نام لیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر ہولے ہولے آگے کِھسکنا شُروع کر دیا۔

سُرنگ میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ کچُھ دُور آگے جا کر سُرنگ بائیں جانب مُڑ گئی۔ یہاں ایک جگہ، چھت پر سے، پانی کے قطرے گِر رہے تھے، اور نیچے پانی کا چھوٹا سا گڑھا بن گیا تھا۔

حاتم نے خُدا کا شُکر ادا کیا اور خُوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پانی پی کر اُس کی جان میں جان آئی۔

وہ آگے بڑھا تو لہروں کی آواز سُنائی دی۔ ذرا آگے جا کر معلُوم ہُوا کہ ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی ہے۔ خُدا جانے یہ نہر سُرنگ میں کہاں سے آتی تھی اور کدھر کو جاتی تھی۔ حاتِم نہر کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ نہر دائیں جانب گھُوم گئی اور سامنے کی پتّھریلی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا، جس میں سے دھیمی زرد روشنی باہر نکل رہی تھی۔

حاتم دیوار کے ساتھ ساتھ کھِسکتا ہُوا دروازے کے پاس آ گیا۔ اُس نے گردن اندر کر کے جھانکا تو سامنے اُونچی چھت والا کھُلا گول کمرا دِکھائی دیا، جس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی مُورتی رکھی ہُوئی تھی۔ مُورتی کی آنکھوں سے سُرخ روشنی کی شُعاعیں نِکل رہی تھیں اور اُس کے سر پر ایک اژدہا بیٹھا زبان نِکال نِکال کر پھُنکار رہا تھا۔ اُس کے کمرے میں قدم رکھتے ہی ایک بھونچال سا آ گیا۔ مُورتی کے مُنھ سے ایک چیخ

نِکلی اور اژدہے نے اُچھل کر حاتم پر حملہ کر دیا۔
حاتِم بے ہوش ہو کر فرش پر گِر پڑا۔

حاتم طائی کو ہوش آیا تو اُس نے کیا دیکھا؟
کیا حاتِم طِلسمی پُتلے کو پھر سے اِنسان بنا سکا؟
حاتِم آدم خور جزیرے سے فرار ہو کر بھارت
کے شہر دِلّی کِس طرح پُہنچا ؟
یہ سب کچھ آپ اِس سِلسِلے کی اگلی قسط
"حاتم طائی دِلّی میں" میں پڑھیں گے۔

حاتم طائی زندہ ہوگیا!



دُکھیوں کا ہمدرد
بے کسوں کا سہارا
اپنے وقت کا سب سے زیادہ سخی اور بہادُر اِنسان
جو 1500 سال پہلے عرب میں فوت ہوگیا تھا

دوبارہ زندہ ہوگیا ہے!

آپ اِس کے حیرت انگیز اور جرأت و بہادُری سے بھرپُور کارنامے پڑھتے وقت ——— ہر ہر سطر پر، اُچھل اُچھل پڑیں گے ———

وہ، اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر، ایک پاکستانی لڑکے کو بھارت کی قید سے چھڑاتا ہے، فلسطینی مُجاہدوں کے ساتھ مل کر اسرائیل کے فوجی اڈّے اُڑاتا ہے، لندن کے لوگوں کو ایک خوں خوار انسانی بھوت سے نجات دلاتا ہے۔

آپ کے جانے پہچانے ادیب **اے حمید** کے اس دل چسپ اور حیرت انگیز ناول کے پانچ حصے چھپ چکے ہیں ———

- حاتم طائی لاہور میں
- حاتم طائی دلّی میں
- حاتم طائی پیرس میں
- حاتم طائی لبنان میں
- حاتم طائی لندن میں



فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

Rs. 150.00


ISBN: 969 0 00265 1

9 789690 002655